ہند کی مایۂ ناز ہستیاں
و
دیگر مضامین

بی شیخ علی



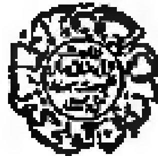
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ہند کی مایۂ ناز ہستیاں

و

دیگر مضامین

بی۔ شیخ علی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت : 1992
دوسری طباعت : 2011
تعداد : 550
قیمت : -/25 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 687

Hind Ki Maya Naaz Hastiyan
aur
Deegar Mazamin

Author :
B. Shaikh Ali

ISBN : 978-81-7587-344-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی-110 006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho (Top) کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

دیباچہ

ملک و ملت کی بقا کے لیے ہمارے بزرگوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اُن کی اہمیت سے شاید ہمارے عوام کُلّی واقف نہ ہوں۔ یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ان کے کارناموں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے سے ہمارے منزلِ مقصود کی رہنمائی ہوگی، بلکہ اس لیے بھی کہ فکرِ صحیح کا یہی تقاضا ہے کہ انسان اعلیٰ اقدار کو جانے، پرکھے اور اپنائے۔ تہذیب و تمدّن کے جو چراغ پہلے سے روشن ہیں، ان کی تابناکی میں اضافہ کرے۔ تاریکیوں کے سیاہ بادل جو منڈلا رہے ہیں، اُن کو دور کرنے کی کوشش کرے، اور قدرت کے اس مقصد کے حصول میں کوشاں رہے کہ ترقی کے میدان میں وہی پیش پیش رہیں گے جو علم و عمل میں سب سے آگے ہوں۔ ان مضامین کا لبِ لباب علم و عمل ہے۔ جس کی شاہراہ پر ہمارے مشاہیر گامزن رہ کر شہرہ آفاق فوقیت کے حامل بنے، اور ہم اس میدان سے غافل رہ کر ناکامیوں کا شکار بنے رہے۔

لہٰذا ان مضامین کا اصل غرض و غایت ہمارے نوجوانوں میں وہ شعور، حوصلہ عزم و استقلال، اور جدوجہد کا ذوق و شوق ابھارنا ہے، جو ہمارے اسلاف میں موجود تھا اور جن کی بے مثال فرض شناسی، دور اندیشی، دانشوری، ایثار و قربانی، علم و حکمت کی فراوانی اور خدمتِ خلق کے جذبے نے انہیں اخلاقی شخصیت کے ایسے اعلیٰ مراتب بخشے تھے جن پر ساری انسانیت ناز کر سکتی ہے۔ یہی اخلاقی شخصیت ہمارے نوجوانوں کا نصب العین بن سکتی ہے۔ یہاں ہماری تہذیبی تاریخ کے صرف چند درخشاں ستاروں کے کارناموں کی ایک ہلکی سی جھلک اس امید سے پیش کی

جارہی ہے کہ شاید ماضی کے اس شاندار اور مضبوط بنیاد کی موجودگی کا احساس ہمارے دلوں میں وہ جوش و خروش ابھارے گا جس سے ایک مستحکم مستقبل کی تعمیر ہوگی۔

اس عدم دلچسپی کا دوسرا اہم سبب ہمارے عوام کو ہماری زبان سے رغبت و شوق پیدا کرنا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اردو جیسی کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی اور فصاحت و بلاغت سے بھری ہوئی اپنی مادری شیریں زبان سے ہمارے نوجوان بے پرواہ ہوتے جارہے ہیں۔ ذریعہ تعلیم علاقائی، یا قومی یا بین الاقوامی زبان بنتی چلی جارہی ہے اور اردو جو ہماری تہذیب و تمدن کی روح رواں ہے صرف آپس میں گفتگو کی حد تک محدود ہو چکی ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ اردو میں تصنیف و تالیف کرنا اُن کی شان کے خلاف ہے۔ ملک سے انگریزوں کے انخلاء کے بعد بھی اردو داں طبقہ کے نزدیک انگریزی زبان کا چسکہ و رتبہ پہلے سے کہیں زیادہ ہی ہو چکا ہے۔ ہماری اردو سے دلچسپی و ہمدردی صرف چند افسانے، غزلیں، نظمیں اور مضامین لکھنے کی حد تک محدود ہو چکی ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ علمی، سائنسی، سرکاری، تجرباتی، تجارتی، صنعتی و کاروباری شعبوں میں بھی اردو کو اس کا جائز حق ملنا چاہیئے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اردو میں تصنیف و تالیف سے نہ گھبرائے اور ہماری توجہ اس طرف زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ تمام علوم کی کتابیں اردو میں لکھی جائیں۔

اس مختصر کتاب کے اصلی محرک جناب اشرف آغا صاحب، ایڈوکیٹ و مدیر منزلِ گوآ، پنجم، گوآ، ہیں، جو گوآ جیسی چھوٹی ریاست کے صرف دو یا تین فیصد اردو داں طبقہ کے درمیان ایک ہفتہ وار اردو کا اخبار نکالتے ہیں اور راقم الحروف کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دیتے رہے۔ چند مضامین منزلِ گوآ کے لیے لکھے گئے تھے۔ یہ مضامین بھی یہاں شامل کیے گئے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے شکریہ کے حقدار جناب اشرف آغا صاحب ہیں۔ اس کے بعد ہم ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈائرکٹر، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی اور ان کے عملے کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اردو بیورو کی معرفت سے ان مضامین کی اشاعت کی ذمہ داری بڑی خوشی سے قبول فرمائی اور بخوبی انجام تک پہنچائی۔ یہ

بات صد قابلِ تحسین ہے کہ ترقی اردو بیورو کا مرکزی ادارہ بصحت صد تک اردو کی ترویج میں منہمک ہے اور اس کے سبھی عہدہ دار اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ راقم الحروف اُن سب کا شکریہ تہہِ دل سے ادا کرتا ہے۔

بی۔ شیخ علی

سلطان شہید کی عظمت

ٹیپو سلطان شہید ہماری تاریخ کے اُن درخشاں ستاروں میں سے ایک ہیں جن کے کارناموں کی روشنی آج بھی جگمگا رہی ہے۔ انھوں نے وطن کی بقا کے لیے نہ صرف تخت و تاج کو اپنے پائے حقارت سے ٹھکرایا بلکہ اپنی جان عزیز کو بھی قربان کر دیا۔ غور سے اگر دیکھا جائے تو ان کی زندگی میں صرف حب الوطنی، شجاعت، اور حق و صداقت کا ہی جذبہ موجزن نہ تھا بلکہ انتظامی، تنظیمی، اخلاقی، تدبر، تفکر، فرض شناسی اور اصول پرستی کا پہلو بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یقیناً یہ حیرت کا مقام ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر میں جبکہ سارے ہندوستان پر زوال مسلط ہو رہا تھا تو قدرت نے میسور جیسے چھوٹے سے آزادی و ترقی کے لیے ایسی عظیم الشان شخصیت پیدا کی جس نے کل ہند میں ایک نشاۃ ثانیہ برپا کرنے کی جد وجہد کی۔ انھوں نے رعایا کی دولت کو اپنی عیاشی پر نہیں لٹایا بلکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف، رواداری اور فیاضی کا سلوک کیا، تعلیم پھیلائی، بداخلاقیوں کو دور کیا، غلط رسموں کو مٹایا، قانون کا احترام سکھایا، حریت کا سبق پڑھایا۔ ان کے اعلیٰ مقاصد، انتہائی جد وجہد اور کوششوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر وہ دشمنوں کے مجبور نہ ہوتے اور خود ملک دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے آزاد رہتے تو ملک میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیتے۔ پھر بھی ان کے زمانے میں میسور ایک جنت نشان ہو گیا۔ یہاں ان کی گوناگوں اصلاحوں میں سے صرف چند پر طائرانہ نظر ڈال لیں گے۔

سلطان ایک بلند ہمت، بہادر، شیر دل فرمانروا تھے، ان میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ انھوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جہاد کرتے کرتے خاک وطن پر اپنا مقدس خون بہا کر اس کے ذروں کو منور کر دیا۔ حب الوطنی اور آزادی کے لیے جب اپنی جان قربان

کردی تو وہ بجا طور پر شہیدانِ وطن کے امام بن گئے۔ اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا ہے:

"آں شہیدانِ محبت را امام * آبروئے ہند و چین و روم و شام" ٹیپو ہندوستان کا وہ پہلا تاجدار تھا، جو برطانوی طاقت کو توڑنے میں ہمیشہ کوشاں رہا۔ سارے ہندوستان میں میسور ہی ایک ایسی ریاست تھی جس نے انگریزوں کے خلاف یکے بعد دیگرے چار جنگیں لڑیں۔ ان میں دو جنگیں تو ایسی تھیں جن میں انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے گئے تھے۔ پلاسی کی جنگ سے لے کر ملک کی آزادی تک ہند کے کسی راجہ یا نواب یا تاجدار کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی تھی کہ انگریز کسی ہندوستانی کا لوہا مانے۔ مگر سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان ٹیپو میسور کی پہلی جنگ میں مدراس کے نواح میں پہنچ گیا اور انگریزوں پر ایسی دہشت وارد کی کہ قلعے کے سردار جہازوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ میسور کی دوسری جنگ میں سلطان نے وہ کارنامہ کیا کہ ہر ہندوستانی کا سر فخر سے بلند ہو سکتا ہے۔ للکارتے ہوئے مدراس سے بھیجی ہوئی فوج پر سلطان ٹوٹ پڑے اور سلطان کی ساری فوج کرنل بیلی کے تحت یا تو کٹ گئی یا حراست میں لے لی گئی۔ خود بیلی گرفتار ہو چکا اور کئی سال سرنگاپٹن کے قید خانے کی ہوا کھاتا رہا۔ جب حکومت مدراس کو اس شکست کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً ایک اور مسلح فوج تیار کی۔ اس کا سردار ہکٹر منرو تھا۔ یہ وہی ہکٹر منرو تھا جو بکسر کی جنگ کا ہیرو سمجھا جاتا تھا۔ بکسر کی جنگ ۱۷۶۴ء میں لڑی گئی جس میں ہندوستان کے تین زبردست بادشاہوں کو شکست فاش ہوئی۔ اودھ کے آصف الدولہ اور بنگال کے میر قاسم کے علاوہ خود مغلیہ خاندان کے شہنشاہ شاہ عالم بھی شامل تھے۔ بکسر کی جنگ پلاسی کی جنگ سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس جنگ کے بعد ہی انگریزوں کو بنگال، بہار کی دیوانی ملی اور وہ قانونی طور پر اس ملک کے حکمران بن گئے۔ اس لیے منرو کی جو عزت و قدر افزائی ہوئی وہ ظاہر ہے۔ جب ایسا منرو سلطان کے خلاف بھیجا گیا تو اس کی تاب نہ رہی کہ مقابلہ کرے۔ وہ اپنے سارے توپ خانے کو کنجیورم تالاب میں پھینک کر اپنی جان بچاتے ہوئے مدراس کی طرف بھاگا۔ انگریزوں کے لیے یہ وہ نازک وقت تھا کہ ان کے قدم اکھڑنے ہی والے تھے کہ وارن ہیسٹنگز نے بنگال سے فوج بھیج کر ڈوبتی کشتی کو بچا لیا۔ اسی میسور کی دوسری جنگ میں کرنل بریتھ ویٹ کا جب مقابلہ ہوا تو اس کی ساری فوج سلطان کے ہاتھ پسپا ہو گئی اور خود بریتھ ویٹ گرفتار ہو کر سرنگاپٹن میں مقید رہا۔ میسور کی تیسری جنگ

یہاں جنرل میڈوس کو بھی اسواری ذلت سہنی پڑی مگر وہ حراست میں لیے جانے سے بچ گیا۔ میسور کی چوتھی جنگ میں فیصلہ کن لڑائی سے صرف چند دن قبل جب کہ انگریزی فوج آرتھر ولزلی کی کمانڈ میں سلطان تبری کے قریب تھی تو سلطان نے ایسا حملہ کیا کہ آرتھر ولزلی کو دوڑ کر اپنی جان بچانی پڑی اور جنرل ہیارس کے کیمپ میں پناہ لینی پڑی۔ یہ آرتھر ولزلی وہی تھا جو بعد میں چل کر نپولین کا فاتح بنا اور ڈیوک آف ولنگٹن کے خطاب سے اعزاز پایا۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ کہیں اس دن سلطان کے ہاتھ میں اگر میں پھنس جاتا تو تاریخ کے اوراق بالکل دیگرگوں ہو جاتے۔ غرض سلطان کی شجاعت کا عجب حال تھا۔

انگریزوں کی آمد کے بعد سلطان واحد تاجدار تھا جو مسلسل اس بات پر مصر رہا کہ ملک کی آزادی سے بالاتر کوئی شے نہیں۔ غلامی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ آزادی کے ایک لمحہ پر غلامی کی حیات جاوداں قربان کر دینی چاہیے۔ اس نے پوچھا "شیر اچھا ہے جسے مہلت ایک روزہ ملی، یا وہ گیدڑ جسے بزغالگی صد سالہ خلود؟" اختر شیرانی نے سلطان کے اس مسلک کا یوں اظہار کیا ہے ـــ

"عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے   عشق میری جان آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کر دوں فدا میں اپنی ساری زندگی   لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

ان کی زندگی ایک طوفان سے بھرپور بھی۔ ان سے بڑھ کر انگریزوں کو کوئی حریف نہیں ملا۔ ان کی حکومت جنگ کے دوران شروع ہوئی اور جنگ کے دوران ختم ہوئی۔ ان کی زندگی اول سے آخر تک جدوجہد اور سعی و عمل کا ایک مسلسل مظاہرہ تھا۔ انھوں نے شیر کی طرح دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اور اپنی تمام زندگی ہندوستان کو اغیار کی غلامی سے بچانے کے لیے وقف کر دی۔ اس کی تمام مساعی کا محور یہی تھا۔ اسی کے لیے وہ جیا اور اسی کے لیے مرا۔ اس کے خواب بھی یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ دشمنوں سے نبرد آزما ہے۔ اس کی زندگی کے دو اہم اصول تھے، ایک تو اسلام کی خدمت اور دوسری وطن کی محبت۔ سلطان ہی ہندوستان کا پہلا حکمران تھا جس نے بیرونی ممالک سے براہ راست تعلقات قائم کیا۔ صرف سلطان روم ترکی سے ہی نہیں بلکہ فرانس، ایران، افغانستان، مسقط، پیگو وغیرہ آدھیا سے بھی اس کے تعلقات تھے۔ وہ انگریزوں کی عیاری اور سیاسی حکمت عملی سے واقف تھا۔ ان کی فوجی طاقت سے

بھی واقف تھا۔ ان کی معاشی، تجارتی اور تکنیکی قابلیت کا بھی احساس تھا۔ ۱۷۸۰ء سے ملک میں جو حالات رونما ہو رہے تھے ان کا بھی اسے بخوبی علم تھا۔ لہٰذا اس کو یہ خیال آیا کہ واحد میسور کی ریاست غیر ملکی اقتدار کو ختم نہیں کر سکتی۔ حیدر علی خاں کے زمانے سے ہی میسور کی پالیسی انگریزوں کے خلاف تھی۔ اس لیے انھیں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک سلطان زندہ ہے ان کی حکومت مستحکم نہ ہو سکے گی۔ وہ بھی ٹیپو کے خون کے پیاسے تھے۔ شمالی ہند کے سبھی حکمران ایک ایک کر کے ختم کر دیے گئے۔ اودھ کے نواب انگریزوں کی مٹھی میں تھے۔ بنگال اور بہار کا سارا صوبہ انگریزوں کی عملداری میں تھا۔ جنوب میں مرہٹے، نظام اور سلطان سیاسی کشمکش میں پھنسے تھے۔ سلطان کی یہ خواہش تھی کہ مرہٹے، نظام اور سلطان تینوں مل کر انگریزوں کو ملک سے بھگائیں۔ اس نے یہ تجویز کئی مرتبہ پیش کی۔ ۱۷۸۶ء میں مرہٹوں اور نظام کی سلطان کے خلاف جنگ میں سلطان کا پلہ بھاری رہا۔ جب یہ جنگ صلح گجیندر گڑھ سے ختم ہوئی تو اس کی ایک شرط یہ تھی کہ چند قلعے مرہٹوں کو اس لیے واپس دیے جا رہے ہیں تاکہ انگریزوں کے خلاف ایک اتحادی محاذ قائم کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کے نظام سے دوستی بڑھانے کی غرض سے اس نے رشتہ داری کی تجویز بھی پیش کی۔ یہ نظام کی کم عقلی تھی کہ انھوں نے رشتہ داری اس بنا پر قبول نہ کی کہ نجابت و شرافت میں نظام کا پلہ بھاری ہے۔ یہ قوم کی بدقسمتی تھی کہ ایسی تنگ نظری ہمارے حکمرانوں میں گھر کر گئی تھی۔ ایک طرف سلطان کی فراخ دلی تھی، دوسری طرف نظام کی کم عقلی و کوتاہی جو صرف اپنے فوری فائدے سے آگے کچھ نہ دیکھ سکتی تھی۔ نظام کے مشیر انگریزوں سے جا ملے تھے۔ بدقسمتی سے میسور کی چار جنگوں میں جو انگریزوں کے خلاف لڑی گئیں، تین جنگوں میں نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور میسور پر چڑھائی کی۔ اس لیے تو کہتے ہیں " عندلیبان چمن نے خود قفس کے شوق میں بیچ ڈالا چند تنکوں کے لیے سارا چمن " غرض ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ سلطان نے نظام کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

نظام کے مقابلے میں مرہٹے تین جنگوں میں نہیں دو جنگوں میں میسور کے خلاف انگریزوں سے جا ملے تھے، میسور کی پہلی اور تیسری جنگ میں۔ فیصلہ کن چوتھی جنگ میں انھوں نے انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔ نانا فرنویس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ سلطان کے بعد انھی کی باری آئے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پانچ سال بھی گزرے نہ تھے جب کہ سلطان شہید ہوا تھا مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ انھیں

حالات کا طرح سلطان کو ہمیشہ اس بات پر مجبور کرتا رہا کہ کسی صورت نظام اور مرہٹے انگریزوں سے ساتھ نہ کریں۔ مگر انگریز سیاسی شطرنج کے ایسے ماہر تھے کہ گیند ہر گام صلح کے دوسرے دن سے ہی وہ بھی انگریزی سفیر مسٹر مالیٹ اسی مہم میں لگ گیا کہ کسی صورت مرہٹوں اور نظام کے ساتھ انگریزوں کے اتحاد کی حالت قائم کریں اور سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکیں۔ جب کارنوالس ہندوستان پہنچا تو اس کی خواہش یہی تھی کہ جلد سے جلد اس کی وہ ذلت دور کی جائے جو اس کو یارک ٹاؤن میں پیش آئی جہاں انگریزوں کو امریکی فوجوں کے ہاتھوں پسپا ہو کر امریکی نو آبادیات کو خیر باد کہنا پڑا تھا یہ وہی کارنوالس تھا جس نے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس ذلت کا بدلہ اور کچھ کفارہ میسور کی تیسری جنگ سے ادا کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی عیاری اپنے شباب پر آ گئی اور وہ کھل کھلا کر میسور کی تیسری جنگ میں وہ تینوں اتحادی بن گئے اور میسور پر دھاوا بول دیے۔

جب سلطان کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ نظام اور مرہٹوں سے کوئی امید نہیں کہ وہ ملک کی آزادی اور اس کی عزت کی بقا کے لیے اس کی تائید کریں گے تو اس نے ملک سے باہر اپنی نظر دوڑائی تاریخ کا اسے علم تھا کہ ۱۷۷۶ میں امریکہ سے انگریزوں کا انخلا فرانسیسیوں کی مدد سے عمل میں آیا تھا۔ ازل سے فرانس انگلستان کے خلاف رہا تھا۔ یہ سیاسی مثل مشہور ہے کہ ہمارے دشمن کا دشمن ہے وہ ہمارا دوست ہے۔ ہندوستان میں بھی فرانسیسی اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے لیکن انگریزوں کی حکمت عملی اور رزم بنگال میں سبقت کی وجہ سے فرانسیسی قدم جم نہ سکے۔ لیکن وہ حیدر علی خان اور سلطان ٹیپو کے بڑے دوست بن گئے۔ میسور کے سلاطین نے بھی ان سے سچی دوستی کا ثبوت دیا۔ اپنا کام بڑھانے کی حد درجہ کوشش کی۔ اور جس طرح امریکہ سے انگریزوں کو فرانس کی مدد سے مار بھگایا گیا اسی طرح ہندوستان سے بھی سلطان کی کوشش اور فرانس کی مدد سے انھیں انگریزوں کو دریا پار کرا دیا جائے۔ اس کے لیے جو جو جد و جہد سلطان سے ممکن وہ پیرس کے تعلقات میں لطف کے لیے کئی سفیر بھیجے، کئی خطوط لکھے اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جس سے یہ روابط مضبوط نہ ہوں۔ یہ سلطان کی بدقسمتی تھی کہ فرانس خود ایک آتش فشاں تجربے سے ہمکنار ہونے والا تھا۔ وہ ایک آفاقی انقلاب کے دہانے پر کھڑا تھا اور کسی وقت اس کا سارا نظام درہم برہم ہونے والا تھا۔ چنانچہ سلطان کے سفیر ابھی ۱۷۸۸ میں پیرس میں ہی تھے، ملک کے بادشاہ لوئی سولھویں سے ملاقات بھی کی، لیکن کسے خبر تھی کہ ملک اس

بادشاہ کے حق میں کیا گل کھلائے گا۔ جو کچھ کر گزرنے کا منظر تھا وہ پیش آیا، اس سے ساری دنیا کا نقشہ پلٹ کر رکھ دیا۔ اس صورت حال نے فرانس کی اس تجویز کو کہ ایک اتحادی معاہدہ ہو، فرانس سے فوجیں آئیں، دونوں مل کر لڑیں اور انگریزوں کا خاتمہ کریں، التوا میں ڈال دیا۔ دو سال بعد فرانس میں قیامت برپا ہوئی اور اس معاہدے پر دفتری دھول جمنے لگی۔

فرانس کی حالت پانچ سات سال میں کچھ سنبھلی اور وہاں نپولین نے اقتدار سنبھالا تو سلطان نے پھر یہی مہم جاری کر دی۔ ۱۷۹۷ء میں پارڈو تالی ایک فرانسیسی کے ذریعے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ نپولین کے دل میں بھی خیال آیا کہ وہ سکندر اعظم بنے۔ ایک بیڑہ تیار کیا، مصر فتح کیا اور وہاں کی تاریخ بدل ڈالی۔ سلطان کو خط لکھا کہ وہ ہندوستان آ رہا ہے، اس کا انتظار کیا جائے۔ دونوں مل کر انگریزوں کا قلع قمع کر دیں گے۔ پر شاید قدرت کو کیا منظور تھا کہ جب مصر سے شام کی طرف نپولین نے کوچ کیا تو وہاں سڈنی سمتھ کی کمان میں انگریزی فوج کا عکہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں نپولین کو فتح نصیب نہ ہوئی۔ اس وقت تک اس کے سارے جہاز سکندریہ بندرگاہ پر انگریز تباہ و غرق کر چکے تھے اس لیے وہ نہ بری راستے سے اور نہ بحری راستے سے ہندوستان پہنچ سکا۔ اس کی خبر ولزلی کو پہنچ گئی اور اس نے میسور کی فیصلہ کن چوتھی جنگ کا پورا پورا انتظام کیا۔ لیکن سلطان کی ہمت اور دور اندیشی کی داد دینی چاہیے کہ ملک کی آزادی کے لیے اس نے کیا کیا تدبیریں سوچ رکھی تھیں۔

ترکی کے تعلقات کا بھی یہی حشر ہوا۔ خطوط لکھے، سفیر بھیجے، معاہدے تیار رہے۔ ملت اسلامیہ کا سہارا ڈھونڈا اور ہر طرح کی حتی الامکان کوشش کی کہ بااقتدار ترک قسطنطنیہ میں سمجھ جائیں کہ دوست کون ہے اور دشمن کون ہے۔ مگر حالات یہاں بھی ناسازگار رہے۔ ایک طرف تو انگریزی مکاری و عیاری بھاری تھی اور دوسری طرف ترکی خود پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ اگر انگریز ہندوستان پر قبضہ جمانا چاہتا تھا تو دوسری طرف روس ترکی کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ ہر طرف ملت اسلامیہ دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ سلطان کی تفصیلی تجاویز کے جواب میں سلطان عبدالحمید نے یہی لکھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں مسلمانوں کے درپے ہیں تو روسی ترکوں کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ پیٹر اعظم کے زمانے سے روس کی یہی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ترکی کو زیر کر کے بحر روم کے ساحل تک پہنچ جائے۔ روس کے اس منصوبے کو توڑنے میں ترکی کو فرانس اور

انگلستان سے بڑی مدد مل رہی تھی۔ اس لیے سلطان نظام اس بات پر راضی نہ ہوا کہ وہ انگریزوں کی دوستی سے ہاتھ دھو لے اور ٹیپو سے مل کر دوسروں کی ہمت افزائی کر دے۔ سلطان کو یہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

سلطان نے سوچا کہ فرانس اور ترکی دور کے مقامات ہیں، نزدیک کے اسلامی ممالک سے کیوں رشتہ نہ جوڑا جائے۔ ایران کا شہزادہ آیا تھا، اس سے بات چیت چلی مگر کچھ نہ بنا لیکن افغانستان سے دوستی بڑھائی گئی۔ افغانوں کا خون گرم ہوتا ہے۔ حریت کے وہ پروانے ہیں اور آزادی کے دیوانے۔ بات کے پکے بھی ہوتے ہیں اور لڑنے میں شیر، جوانمرد و بہادر۔ لہٰذا سلطان کی نگاہ زمان شاہ پر جا لگی۔ یہ احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہ ابدالی جس نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو ۱۷۶۰ء میں شکست دی تھی۔ سلطان نے ہندوستان کی ساری حالت کا نقشہ اور مغل خاندان کی درگت کا خاکہ پیش کر کے زمان شاہ کو کسی صورت راضی کر لیا کہ وہ دہلی پر چڑھائی کر دے۔ چنانچہ ۱۷۹۸ء میں جبکہ نپولین بھی ہندوستان آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ زمان شاہ کابل سے لاہور کی طرف چل پڑا۔ درمیانی سارے علاقے فتح کر لیے۔ سلطان کو جھلک بھی آئی کہ دشمنانِ اسلام کا خاتمہ بس قریب ہے۔ انگریزوں کے حواس اڑ گئے۔ نادر شاہی و احمد شاہی حملوں کی یاد پھر تازہ ہونے لگی، لیکن سیاست کا شطرنج بھی عجیب ہوتا ہے۔ انگریزی حکمت عملی پھر کام میں آنے لگی۔ اس مرتبہ زمان شاہ سے رزم و پیکار کی بجائے نہ سوجھی، ایک مکاری و فریب کی داؤ چال سے بمبئی کے گورنر ڈنکن کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مراد آباد کے ایک شیعہ مہدی علی خان کو ایران کے بادشاہ بابا خان کے دربار میں اس تجویز کو پیش کرنے کے لیے بھیجا کہ ایران کے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ وہ ہرات پر فوراً قبضہ کر لے جبکہ زمان شاہ لاہور پہنچ گیا ہے۔ یہ دسمبر ۱۷۹۸ء کی بات ہے۔ چنانچہ جب زمان شاہ کو معلوم ہوا کہ خود اس کی سلطنت خطرہ میں ہے تو لاہور سے آگے دہلی کی طرف مڑنے کے بجائے اضطراری میں اپنے وطن لوٹ گیا تاکہ اس کا تخت سلامت رہے۔ یوں یہاں بھی سلطان کو ناکامی ہوئی اور یہ کمند اس وقت ٹوٹی جب کہ نشانہ پر بیٹھنے ہی والا تھا۔

سلطان کی نپولین اور زمان شاہ سے جو مراسلت ہوئی اس کی ایک تیسری کڑی خود اس کے ہمسایے کے ساتھ تھی۔ حیدر آباد سے پھر تعلقات کچھ اچھے ہو گئے تھے۔

اس پہ کہ ۱۷۹۵ء میں جب مرہٹوں نے کھرڈہ کے مقام پر حیدرآباد (نظام) کی دھجیاں اڑا دیں تو نظام نے گڑگڑا کر انگریزوں کی مدد مانگی تھی۔ سیاست میں دوستی کی توقع بیکار ہے۔ انگریز ٹس سے مس نہ ہوئے اور نظام کو اُس کی حالت پر چھوڑ دیا۔ انگریزوں کی اس نامعقول حرکت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطان نے حیدرآباد سے پھر مراسم بڑھائے اور نظام کو یہ رائے دی کہ انگریزی فوج کو ہٹا کر اس کی جگہ فرانسیسی فوج کو تیار کر کے رکھ لے۔ چنانچہ نظام نے ریمانڈ کی کمانڈ میں ۱۴ ہزار کی اچھی زبردست فوج کا بندوبست کر دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جونہی یورپ سے نپولین آئے گا زمان شاہ افغانستان سے، سلطان میسور سے اور ریمانڈ حیدرآباد سے۔ یہ سب اٹھ کر برطانیہ حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ کر دیں گے۔ مگر ولزلی چونک گیا۔ پہلا تو مہدی علی خان کو طہران بھیج کر زمان شاہ کی واپسی کا انتظام کیا، اور پھر حیدرآباد کی طرف توجہ فرما کر نظام کو ماتحتی میں ایسا پھنسایا کہ سب سیڈیری سسٹم کے تحت ریمانڈ کی فوج برخواست کروا دینے اور انگریزی فوج کے قبول کروا لینے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میسور کی چوتھی جنگ میں نظام کی شرکت کا بھی وعدہ لے لیا۔ اُسی دن سے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔

غرض سلطان اپنے منصوبے کی تیسری کڑی میں بھی ناکامیاب رہا۔ دنیا میں بہت سی عظیم المرتبت ہستیاں ایسی گزری ہیں کہ وہ بظاہر ناکام رہیں مگر پھر بھی دنیا نے ان کے سر پر عظمت کا تاج رکھا اور ان کی یاد کو قلوب میں جگہ دی۔ سقراط کا زہر پی لینا اس کی بزدلی نہیں بلکہ عظمت کی دلیل ہے۔ حضرت عیسیٰ کا سولی پر چڑھنا ان کے مذہب کا اختتام نہیں بلکہ افتتاح ہے، رسول کریم کی ہجرت اسلام کی فتح ہے۔ قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے۔ اسی طرح ٹیپو کی ناکامی ان کی عظمت کو کم نہیں کر سکتی، اضافہ کرے گی۔ نظام حیدرآباد انگریزوں سے جا ملے، سلطان کو جام شہادت پلانے میں انگریزوں کا ہاتھ بٹایا۔ لیکن شہید کے گنبد کی وہ شان ہے کہ علامہ اقبال پکار اٹھتے ہیں۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں — محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

سلطان کی سیاسی پالیسی پر نظر دوڑانے کے بعد اس کی داخلی پالیسی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ رام دیپکار کی معروفیتوں کے باوجود سلطان نے اتنا بہتر جامع اور مستحکم نظام قایم کیا تھا کہ وہ آج بھی مہذب ممالک کا منصب معین بنا ہوا ہے۔ اگر دشمن سے تعریف نکلے تو وہ صداقت پر مبنی ہو گی۔ ایک انگریز مورخ مور رقمطراز ہیں "جب آپ اجنبی ملک سے گزر رہے ہوں اور دیکھیں کہ زراعت ترقی پر ہے، شہر آباد ہیں، صنعت و حرفت کو ترقی ہو رہی ہے، تجارت فروغ پا رہی ہے، اور ہر کام پر ترقی یہ ظاہر کر رہی ہو کہ رعایا خوشحال ہے تو سمجھو کہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق ہے۔ یہ ہے ٹیپو کی حکومت کا نقشہ۔" یہ صورت حال اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ حکمران اپنے یا اپنے خاندان کے لیے نہیں، مادی منافع اور جاہ و حشم کے لیے نہیں بلکہ قوم اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے حکمرانی کرے۔ بظاہر سلطان کی حکومت کا ڈھانچہ خلیفہ طرز کا تھا جس میں حکمران خود ہی قانون ساز تھا، خود ہی اعلیٰ ترین قاضی، سپہ سالار اور انتظامیہ کا سربراہ، لیکن سلطان ایک جمہوریت پسند انسان تھا۔ اپنے آپ کو محض "شہری ٹیپو" کہا کرتا اور جمہوریت کے ان اصولوں سے بخوبی واقف تھا جن کی بنا پر فرانس میں انقلاب عظیم برپا ہوا تھا چنانچہ اس نے سرنگاپٹن میں ایک جیکوبن کلب کی بنیاد ڈالی اور اپنے محل کے سامنے "درخت آزادی" لگایا تاکہ عوام پر یہ ثابت ہو کہ وہ ایک شہری ٹیپو تھا۔

جدت و اختراع کا سلطان کو ایسا شوق تھا کہ کئی شہروں کے نام بدل ڈالے سرنگاپٹن کا ظفرآباد، میسور کا نظرآباد، بنگلور کا دارالسرور، کشنگری کا فلک الاعظم، بلاری کا ظفر پٹن اور سرا کا رستم آباد وغیرہ۔ ہندوستانی کو سن، ولادت کے بابت پہچانے کے لیے سال و ماہ بدل ڈالے، ہجری کے بجائے مولودی قایم کی۔ مہینوں اور سالوں کے نام حروف ابجد میں منتقل کر دیے، حساب لکھنے کا طریقہ بدل دیا، ایک نئی تقویم ایجاد کی۔ تعبیر میں اختراعی کمال کر دکھایا یہاں تک کہ چند امراض کے ایسے نسخے سوچے کہ طبیب بھی حیران تھے۔ سلطان کی علم پسندی اور علم پروری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ انھوں نے جامع الامور کے نام سے سرنگاپٹن میں ایک یونیورسٹی قایم کی تھی جس میں دینی علوم کے علاوہ، دنیاوی علوم و فنون کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ سلطان خود مصنف بھی تھا۔ فن انشاء، طب اور مذہبیات میں دسترس رکھتا تھا۔ پینتالیس سے زیادہ کتابیں سلطان کی نگرانی میں لکھی گئیں۔ اس کی لائبریری میں دو ہزار سے زیادہ قلمی نسخے تھے۔

سلطان کی تنظیمی صلاحیت حکومت کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ میسور ٹکسال میں پانچ ٹکسالیں تھیں۔ سونے اور چاندی کے سکے محل کے اندر ڈھالے جاتے تھے۔ سکے پر ٹیپو کا نام کھدا ہوا نہ ہوتا تھا۔ رسول کریم کے نام پر سونے کا سکہ احمدی کہلاتا تھا، نصف مہر صدیقی، چہارم فاروقی۔ چاندی کا سکہ حضرت علی کے نام پر حیدری اور تانبے کا سکہ امام زین العابدین کے نام پر عثمانی کہلاتا تھا۔ ان کے علاوہ بعض اماموں کے نام پر دوسرے سکے عابدی، جعفری اور کاظمی کہلاتے تھے۔ ہر شہر میں ایک قاضی اور ایک پنڈت ہوتا تھا۔ ایک عدالت عالیہ بھی قائم تھی۔ ایک نئے طرز کی سزا بھی سوچ رکھی تھی جس سے ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ درخت اگانے کا انھیں اس قدر شوق تھا کہ ہر مجرم کو اس کے جرم کی مناسبت سے ایک پودا لگا کر اس کو اگانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ چنانچہ معمولی جرم کے لیے ایسا درخت تجویز پاتا جس کے اگانے میں کم محنت و مشقت پیش آتی۔ اگر جرم سنگین ہو تو آم یا ناریل یا دیگر ایسے قسم کے درخت ہوتے جس کے لیے کافی محنت و طویل مدت درکار ہوتی۔ اس طریقہ کار سے ملک کا ہر گوشہ ہرا بھرا ہو جاتا تھا۔ بنجر پتھریلی اور پہاڑی زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لیے رعایا کو ہر طرح کی سہولت مہیا کی جاتی۔ غریب کسانوں کو ہل، بیل، اور بیج تقاوی دیے جاتے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ زمین اس کی تھی جو اس کو بوتا تھا۔ بیرونی تجارت کا قلع قمع کر دیا گیا تھا۔ یعنی انگریزی کمپنیاں جو ملک کی دوسری ریاستوں میں فائدہ اٹھا رہی ہیں، میسور میں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ ریاستی کوٹھیاں مقرر کی گئیں تھیں۔ اندرون ملک جیسی اور غیر ممالک میں سترہ منڈیاں کھولی گئیں۔ مسقط سے زعفران کے بیج، ریشم کے کپڑے، گھوڑے، پستہ، موتی، تانبہ، گندھک درآمد کیے جاتے اور کرناٹک سے مسقط کو ہاتھی دانت، صندل کی لکڑی، سیاہ مرچ اور کپڑا بھیجا جاتا تھا۔ تجارت کی منڈیاں جدہ، عدن اور بصرہ میں بھی قائم تھیں۔

رعایا کی تجارت میں دلچسپی بڑھانے کی غرض سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا گیا تھا جو آج کل کی جائنٹ سٹاک کمپنی کے طرز پر تھا۔ اس کمپنی کے حصص ہر خاص و عام کے لیے موجود تھے۔ ہر وہ شخص جو پانچ روپے سے پانچ سو روپیوں کے حصص خریدتا اس کو پچاس فیصد منافع دیا جاتا۔ پانچ سو سے پانچ ہزار روپے تک بارہ فیصد منافع تھا۔ اس طرح کم سرمایہ والوں کو تجارت کی ترغیب کے لیے زیادہ منافع دیا جاتا۔ ٹیپو نے سماجی اصلاح کا بیڑا بھی اٹھایا۔ شراب حرام کر دی گئی عصمت فروشی کو جرم قرار دیا گیا، غلامی کا انسداد کیا گیا۔ ستر پوشی لازمی قرار دی گئی۔ [illegible]

دیگر رسومات کے بے جا اسرافات پر پابندی لگا دی گئی۔ آمدنی کا صرف ایک فیصد حصہ ان رسومات پر خرچ کرنے کی اجازت تھی۔ نظام کہن کی ہر وہ چیز محض نا پسند تھی جو مضر تھی۔ وہ پہلے ہندوستانی تاجدار تھے جنھوں نے مغربی طریقہ پر سلطنت کو منظم کیا۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت کو فروغ دیا۔ عوام کی خدمت ان کا مسلک تھا۔ ان کے حقوق کا تحفظ ان کا اولین فرض تھا۔ سلطان کی حق پرستی مشہور ہے۔ اپنے بڑے بیٹے کو ایک کسان کے کھیت میں سے بلا اجازت سبزیاں لینے پر سزا دی تھی۔ قلعہ ڈنڈیگل پر حملہ کرتے وقت یہ حکم دیا کہ قلعہ کی پچھلی طرف سے گولہ باری نہ کی جائے کیونکہ اس طرف راجہ کا مندر تھا۔ ان کی مذہبی رواداری و احترام کی مثال ہے جب یورپ کی کسی حرکت پر سلطان سے شکایت کی گئی اور تنبیہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی اور جب مشیروں نے یہ کہا کہ برہمنوں کی قوم غدار ہے تو سلطان نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی لَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ۔ صرف ظلم کرنے والوں پر زیادتی کرو۔ یعنی کسی ایک کی غلطی کی وجہ سے ساری قوم کو برا نہیں کہہ سکتے۔

انگریزوں نے ان کی مذہبی پالیسی پر کافی کیچڑ اچھالا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے سلطان نے ہر مذہب و ملت کے ساتھ رواداری کا سلوک کیا۔ سری رنگا پٹن، ترچناپلی، میسور، بنگلور اور کاسٹ اور ڈنڈیگل میں ہندوؤں کے مندروں کو سلطان کی عطا کردہ جاگیریں اب تک موجود ہیں۔ سرینگری کے سوامی جی کو سلطان کے لکھے ہوئے خطوط سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے دل میں ہندوؤں کے مذہب کا کتنا احترام تھا۔ مرہٹہ سردار پرشورام بھاؤ کی فوج میسور پر حملہ کے وقت سرینگری کے شاردا مندر کا کافی نقصان کر چکی تھی یہ خطوط ۱۹۱۶ء میں آر۔ نرسمہا چار نے سرینگری کے کاغذات کے دفتر سے چھاپے جو سلطان کی مذہبی پالیسی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ سلطان نے سوامی جی سے ساری سلطنت کی بہبودی کے لیے دعا مانگنے کی درخواست کی۔ ٹوٹے ہوئے شاردا مندر کی مرمت کا خرچ برداشت کیا۔ شاردا مورتی پر چڑھانے کے لیے کم خواب بھیجا۔ اور سوامی جی کے لیے شال اور دو پالکیاں بھی بھیجیں۔ ایک مورتی کے لیے اور دوسری سوامی جی کے لیے۔ سرینگری ہی نہیں بلکہ ریاست کے کئی مندروں کو انھوں نے تحفے دیے۔ نجنگوڈ تعلق کے کلالے مقام پر لکشمی کانت مندر کے لیے چار چاندی کے برتن، میلکوٹ میں نارائن سوامی مندر کے لیے سونے اور چاندی کے برتن، چند ہیرے اور ایک ہاتھی، نجنگوڈ، سری رنگا پٹن کے مندروں

کے لیے بھی کئی سونے اور چاندی کے بوٹے اور برتن اور پوجا کی دیگر چیزیں عطا کیں۔ پٹن میں مسجد اعلیٰ اور مندر پاس پاس ہی تھے جہاں مسجد کی اذان اور مندر کی گھنٹی دونوں اس کا احترام رکھتے تھے۔ میلکوٹ مندر کا کچھ تنازعہ تھا تو لوگوں نے سلطان سے انصاف کی مدد مانگی اور اس کے فیصلے کو دونوں فریق نے خوشی قبول کر لیے۔ سلطان کی بے تعصبی، رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کی نظیر آج بھی نہیں ملتی۔ سلطان نے اگر مساجد کو جاگیریں عطا کیں تو ہندوؤں کے مندروں کو بھی کافی جاگیریں دیں۔ ان کے فرامین جو اب تک موجود ہیں جن سے سلطان کی وسعت قلب اور رواداری کا پتہ چلتا ہے۔

سلطان کا مقصد عوام کی مالی و سماجی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ ۱۰ ستمبر ۱۷۸۶ء کو انہوں نے سرنگا پٹم کے قلعہ دار کو لکھا کہ برہان الدین اور کستوری رنگا بنگال سے ریشم کے کیڑے لا رہے ہیں، ان کی حفاظت و پرورش کی جائے۔ یہ خط اس وقت لکھا گیا جب کہ سلطان خود مرہٹوں اور نظام کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ یعنی عین لڑائی کے وقت بھی ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے اپنا وقت نکال لیا کرتا تھا۔ ریاست بھر میں اس کام کے لیے ۲۱ مرکز کھولے۔ سرنگا پٹم کے لوہے اور فولاد کے کارخانوں میں بندوق، توپ، بارود، تیغ اور گھڑیاں تیار کیے جاتے تھے۔ قسطنطنیہ کو جب سفیر گئے تو یہاں کے بنے ہوئے راکٹ بھی بطور تحفہ ساتھ لیے گئے۔ جنہیں سلطان روم نے بے حد پسند فرمایا۔ حال ہی میں جب امریکہ نے راکٹ کی تاریخ لکھنی شروع کی تو حیدر علی خان اور ٹیپو کا نام سرخ فہرست کے بانیوں میں شمار کیا ہے۔ حال ہی میں ایک جرمن انجینئر سلطان کے فولادی ہتھیاروں کی ہیئت پر تحقیق کر رہا ہے۔ سرنگا پٹم میں بنے ہوئے توپ یورپی توپوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ سلطان نے ملک میں موتی نکالنے کی صنعت ۱۷۹۰ء میں مالابار میں منگلور کے قریب قائم کی۔ سرنگا پٹم کا کاغذ کا کارخانہ مشہور تھا۔ ایک فرنچ انجینئر نے سرنگا پٹم میں ایک انجن بنایا تھا جو پانی سے چلتا تھا اور جس سے توپ میں سوراخ کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ سلطان ہی ہندوستان کا واحد حکمران تھا جس نے جہاز رانی کی طرف بھی توجہ دی اور وہ اس میدان میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی دلی آرزو تھی کہ ریاست میں ایک قومی بحری بیڑہ تیار کیا جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ تجارت اور جہاز سازی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ۱۷۹۳ء میں سلطان نے ایک سو جہاز بنانے کا حکم صادر کیا۔ ان میں دو سے تمام تعمیری ادارے ابھی بن سکے۔ میجر کرک پیٹرک جو ۱۷۹۳ء کا سفیر تھا رقمطراز ہے کہ جہاز

ٹیپو کی ریاست میں پہنچتے تھے وہ اپنی مضبوطی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔ دریائے کاویری پر بند باندھ کر نہری آبپاشی کی تجویز سلطان ہی نے سوچی تھی۔ آج بھی ان کے منصوبے کا کتبہ کرشنا راج ساگر ڈیم پر قدم رکھنے سے پہلے جو بلند دروازہ ہمیں ملتا ہے وہاں چسپاں ہے جو ہمیشہ ان کی دور اندیشی کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ کرواتا ہے۔

غرض سلطان شہید ملک میں ایک نیا انتظام قائم کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ ان کا دماغ نہایت تیز تھا۔ انھوں نے ایسے قوانین نافذ کیے اور ملک کی ایسی پالیسی اپنائی کہ ایک شاعر پکار اٹھا ـــ "پھر گئی آنکھوں میں فردوس بریں کی تصویر" ان کا پہلا سبق انقلاب تھا۔ ہر چیز میں انقلاب۔ یہ دنیا انقلاب کا گھر ہے اور ان کی زندگی کا مسلک انقلاب تھا۔ نظام حکومت میں انقلاب، معاشی، تجارتی، تعلیمی و صنعتی شعبوں میں انقلاب، تفکر، تدبر، تنظیم و رزم پیکار میں انقلاب، ان کی زندگی کے دو اہم اصول تھے۔ ایک تو اسلام کی خدمت اور دوسرے وطن کی محبت۔ وہ اگر چاہتے تو بآسانی دوسرے راجے اور نوابوں کی طرح انگریزوں کی قیادت قبول کر کے عیش و عشرت سے اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے ایسی زندگی پسند نہیں کی۔ ایسے وقت پر جب کہ حالات انگریزوں کے سازگار ہو رہے تھے اور غیر تو غیر اپنے بھی پرائے ہو رہے تھے، وہ اپنی مصلحت اندیشی سے تخت و سلطنت بحال رکھ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اس کو ٹھکرا دیا اور موت کو بے غیرت زندگی پر ترجیح دی۔ صرف حب الوطنی ہی نہیں زندگی کے ہر پہلو میں آن کے بچے تلے اصول نظر آتے ہیں۔ وہ مذہب اسلام کے پیکر تھے۔ انھوں نے دنیا کو یہ دکھلا دیا کہ ایک مسلمان پکا مسلمان ہو کر بھی محب وطن ہو سکتا ہے۔ اور اسلام اور حب وطن ایک ہی سینہ میں جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ جلیل القدر انسان ملت کی کتاب عظم کے اوراق پریشان کی شیرازہ بندی کا عزم لے کر آیا تھا اور وہ اسی مقصد کے لیے زندہ رہا اور۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر جان دے دی۔

سرسید کی خدمات

قوم کی کشتی ڈوبنے والی ہی تھی کہ ایک مرد مجاہد نے آگے بڑھ کر بچا لیا۔ اٹھارویں صدی کے وسط سے ہندوستان کے باشندوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً مصیبتوں کے وہ پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ یہ شخص کی ساری خلقت صرف غلامی کے پھندے میں ہی نہیں پھنسی بلکہ قعر مذلت میں بھی گر گئی۔ ۱۸۵۷ء میں تو قیامت صغریٰ ہی برپا ہو گئی۔ ایسے کڑے وقت میں صرف ایک بہادر کی دور اندیشی، بہت استقلال، ان تھک کوشش اور حکمت عملی سے وہ کرشمہ ظہور میں آیا کہ مسلمان پھر سر اٹھانے کے قابل بن گئے۔ وہ مرد مجاہد سرسید احمد خاں تھے۔ یہ وہ ان کا احسان تھا کہ بھنور میں پھنسی ناؤ کو ابھرے ساحل پر لا پہنچایا۔ یہاں ان کی سیاسی پالیسی کا نہیں بلکہ صرف چند تعلیمی، تہذیبی، تمدنی، علمی خدمات کا تذکرہ کیا جائے گا۔

سرسید کے ذہن میں یہ بات آئی کہ مسلمانوں کے زوال کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ انھوں نے تحصیل علوم و فنون میں کوتاہی کی۔ سیاست، حکومت، ملوکیت اور شہنشاہیت کے غرور میں مدرسگاہوں، تجربہ گاہوں اور دارالعلوم میں جو دلچسپی لینی تھی، نہیں لی۔ اس کے برعکس یوروپی اقوام نے علوم و فنون میں وہ حصہ لیا کہ وہاں نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) برپا ہو گیا۔ اس نشاۃ ثانیہ کی بیخ و بنیاد مسلمانوں نے ہی ڈالی تھی۔ یونان کا سارا فلسفہ، ادب، منطق، طب، اقلیدس، تاریخ، ادب، علم حیوانات، نباتات، جمادات سب کچھ عربی میں ڈھال کر قرون وسطیٰ میں تہذیب و تمدن کے میدانوں میں مسلمان ہی سب سے آگے رہے تھے۔ لیکن ترکوں کی قیادت میں پندرہویں صدی سے حکومت و اقتدار کا یہ اچھا لگاؤ تعلیمی رجحان بالکل ختم ہو چکا۔ یوروپ کے دارالعلوم اپنے دور گراں خوابی سے جاگ اٹھے۔ لوگ ان

روما کے تہذیبی خزانوں کی تلاش میں وہ اس قدر سرگرم رہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ کسی نے تو پریس ایجاد کیا۔ کسی نے مطبع کا اختراع کیا۔ کسی نے قطب نما کا سراغ لگایا۔ کسی کو مذہبی تقلیدی دقیانوسی کمزوریوں کو دور کرنے کی ٹھانی۔ کسی کو ایک اچھی ریاست بنانے کی سوجھی۔ کسی کو زیست کا جذبہ ابھارنے کا شوق لگا۔ کسی کو سمندر پار نئی دنیا کی تلاش رہی۔ کسی کو معماری میں، کسی کو سنگ تراشی میں، کسی کو مصوری میں، کسی کو ادب میں اور کسی کو فلسفہ میں دلچسپی رہی۔ غرض سارے یورپ میں ندرت و جدت کی دھوم مچ گئی اور مسلمان خواب خرگوش میں پڑے رہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ صرف ایک دو صدیوں کے اندر جو آقا تھے وہ غلام ہوئے۔ جو عالم تھے وہ جاہل بنے۔ جو تونگر تھے وہ فقیر بنے۔ اقوام یورپ نے جو سبقت مسلمانوں سے چھینی، اس کو انھوں نے نہ صرف بحال ہی رکھا، بلکہ ایسا فروغ دیا کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔ یہ علوم و فنون کا جادو تھا۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اس حقیقت کو تاڑ لیا کہ علم ہی وہ دولت ہے جو لٹانے سے بڑھتی ہے اور بچانے سے گھٹتی ہے۔ اس میدان میں اگر مسلمان بھی کوشش کرکے مقابلہ کے لیے تیار ہوں تو زیست کی کچھ امید ہے۔ اسی لیے مسلمانان ہند کو انھوں نے علم جدید کی طرف راغب کیا۔ "پڑھیں فارسی بیچیں تیل" کی حقیقت کو واضح کرکے یورپی علوم و فنون کی تحصیل پر انھیں آمادہ کیا۔ علامہ اقبال نے بھی اس کو تاریخی کالا کر یوں کہا ہے — "شکایت مجھ کو ہے یارب خداوندان مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا"

سرسید کا یہ بڑا احسان ہے کہ تعلیمی معاملوں میں مسلمانوں کو تعصب سے روکا۔ انگریز دشمن ہوں گے، لیکن انگریزی میں جو علوم ہیں ان سے دشمنی ٹھیک نہیں۔ مغربی اقتدار سے ہمیں شکایت ضرور ہے مگر مغربی عالم سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں۔ مغربی سیاست ہمارے لیے زہر ہے۔ لیکن مغربی علوم و فنون میں ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔

مسلمانوں کو یہ سمجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اولاً تو اس میں یہ اعتراف تھا کہ ہماری چیزیں گندی ہیں، ہمارے علوم گھٹے ہیں، ہماری تہذیب پست ہے۔ اس لیے سب کچھ یورپ سے لو۔ وہاں کی ساری چیزیں اعلا و ارفع ہیں۔ ہماری بقا اسی میں ہے کہ سیاست میں ہی نہیں، علوم و فنون میں بھی، تہذیب و تمدن میں بھی اور اخلاق و عادات میں بھی انھیں

یورپ کے غلام بنے رہیں۔ اپنی توہین برداشت کریں، اغیار کی برتری کا اقرار کریں۔ مسیکالے نے جو کہا تھا اس کو سچ سمجھیں کہ مشرق کے سب سے علوم مغرب کی ایک دو الماریوں کی چند کتابوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔ بھلا یہ سب اس قوم کی غیرت کیسے گوارا کرے گی جو کسی زمانے میں آفتاب کی طرح چمکتی تھی جو یورپ کو درس دے چکی تھی، انھیں نیچا دکھا چکی تھی۔ الحمرا و قرطبہ کے نقوش اس کے دل میں کندہ تھے، صلاح الدین ایوبی کے دندان شکن حملوں کی یاد تازہ تھی بحر ظلمات کو سے بحر الکاہل تک طوفان کی طرح پھیل جانے کی داستان از بر تھی۔ آج وہ حلقہ میں یورپ کا طوق امتیاز قبول کر لینا زہر کے گھونٹ پینے سے بھی زیادہ دشوار تھا۔ ظاہر ہے کہ سرسید کو اپنی قوم سے یہ منوانا کہ یہ امرت ہے، پی لو، کتنا دشوار ثابت ہوا ہو گا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک انگریز مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ انھیں مارا، کچلا، لوٹا۔ ان کی حکومتیں چھینیں، ان کے اقتدار کا خاتمہ کیا، ان کی جاگیریں ضبط کیں، انھیں ملازمتوں سے الگ کیا۔ ان کی زمینیں، ان کی دولت، ان کی ثروت، ان کی عزت، ان کی آبرو، ان کی ہر چیز پر ڈاکہ ڈالا۔ اب ایسوں سے کیسے مصالحت کی جائے؟ کیسے ان کی زبان، ان کے علوم، ان کے فنون اور ان کی تہذیب و تمدن کو آنکھوں سے لگایا جائے اور کیسے ان کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ اس مجبوری کا تدارک بھی سرسید کے لیے کس قدر دشوار ثابت ہوا ہو گا۔

تیسری مشکل یہ تھی کہ زبان و علوم سے زیادہ عزیز شے ان کا ایمان تھا۔ "مذہب جو نہیں تم بھی نہیں" کے مصداق مسلمان سب کچھ کھو کر مذہب سے چپٹے رہے تھے۔ اس پر بھی اب یلغار کیا؟ وہ کیسے راضی ہو جاتے کہ زبان، علوم اور تہذیب کی آڑ سے مذہب پر چوٹ نہ آسکے گی؟ ہمارا سارا تہذیبی اثاثہ عربی، فارسی اور اردو میں تھا۔ اس کو چھوڑ دیں تو آئندہ نسلیں کیسے ہماری تہذیب کا احترام کر سکیں گی؟ مشنریوں کی کرتوت ایک صد سال سے برابر جاری تھیں۔ کیا اب ان کی اللہ ہمت افزائی نہ ہو گی؟ ختنہ کی بے بہا دین کی وجہ سے ہی غدر کا طوفان آیا تھا اور اب جو سارے اسلامی سلیقوں کی بات بگڑ گئی تو اسلامیت کہاں باقی رہے گی جو بہشت کی ہم سایہ تعلیم سمجھتے ہو تیں، تو آخری حربہ مسلمانوں کو پھنسانے کا علوم و فنون کا نکلا۔ کیا یہ مکاری نہیں ہے؟ مسلمان ہر چیز کھو چکا تھا لیکن ایک چیز جو اپنی جان سے پیاری تھی، اس پر بھی اب تلوار تیز کی جا رہی تھی۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے یہاں بھی سرسید کو جو دشواریاں پیش آئی

ہوں گی اس کے قیاس سے ہی ہمیں خوف ہوتا ہے۔

ان دشواریوں کے باوجود مرد مجاہد نے ہمت نہ ہارا۔ ایک طرف ساری قوم تھی اور دوسری طرف تنہا صرف ایک مرد مجاہد۔ ہر سوال کا اس نے خاطر خواہ جواب دیا اور معترضین کا کامیاب رہا۔ مگر یہ کامیابی آسانی سے حاصل نہیں ہوئی۔ "استادی نہیں حق کی کچھ ملا گئی" بہت یاں ہیں وہ کار۔ قربانیاں دیں، انہیں کافر کے فتوے ہر جگہ سے ملنے لگے۔ ہزاروں تہمتوں کے بازار گرم ہونے لگے۔ ان کے ہر کام میں رکاوٹ ڈالی جانے لگی۔ لیکن پھر بھی وہ ہمت نہ ہارا۔ صبر و استقلال، دور اندیشی و مصلحت اندیشی سے کام لے کر ہر دشواری کا سامنا کیا۔

پہلا سوال مسلمانوں کے شاندار ماضی کا احساس تھا جو کسی بھی تنزل کو بآسانی قبول کرنے میں مانع تھا۔ سر سید نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ "پدرم سلطان بود" سے کام نہ چلے گا یہ سوچنا ہے کہ ہم کیا ہیں۔ ماضی تو گزر گیا لیکن حال میں بھی صرف ماضی ہی مد نظر ہو تو مستقبل کا اللہ ہی حافظ۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد اوج ثریا پر مقیم تھے مگر ہم ان کی خاک بھی نہیں۔ اس پر غور کرنا ہوگا کہ وہ کیسے آسمان عروج پر پہنچے تھے اور ہم کیوں قعر مذلت میں گرے ہوئے ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ جو تفکر، جو جدت، جو ندرت، جو عمل اور جو علم ان بزرگوں میں تھا، وہ ہم میں نہیں۔ جب تک اس کو حاصل نہ کیا جائے ہمارے پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ یہ ساری جدت و فکر و عمل یورپ نے اپنا لیا ہے۔ یہ علم و حکمت ہمیں ان سے چھین لینا ہے۔ یہ چوری نہیں، دغا نہیں، فریب نہیں، مکر نہیں، علم کسی قوم کی جاگیر نہیں، ہر فرد کا حق ہے، ہر قوم کی ملکیت ہے۔ "حکمت کو ایک گمشدہ لعل سمجھو، جہاں پاؤ اپنا مال سمجھو۔" اپنا ہی مال آج یورپ میں بکھرا ہے۔ اس کو ہمیں اپنی محنت و ذوق کے دام سے خریدنا ہوگا۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ اگر یورپ کا مقابلہ کرنا ہو تو یورپ کی چال سمجھنا ہوگا۔ بقا اُن کے تقلید میں مضمر ہے۔ ہمیں اس کو اپنانا ہوگا۔ یورپ کے پاس اگر توپ ہو تو ہم اس کا مقابلہ تلوار سے تھوڑی کر سکتے ہیں۔ ویسی ہی توپ ہمیں بنانا ہوگا۔ ان سے سیکھنا ہوگا کہ کیسے توپ بنتے ہیں۔ اس میں کوئی شرم کی بات نہیں، غیرت کا سوال نہیں۔ سیکھنے سکھانے، پڑھنے لکھنے میں کوئی عار نہیں۔ آخر قدرت کا کھیل ہے۔ قدرت نہیں چاہتی کہ فضیلت کسی ایک کی ہی غلام بنی رہے۔ کبھی چین، کبھی مصر، کبھی عرب، کبھی یونان،

کبھی روما، کبھی دمشق، کبھی بغداد، کبھی الحمرا، کبھی قرطبہ، وہ ہر جگہ گھومتی پھرتی ہے۔ جس نے اس کو چاہا وہ اسی کی ہو جاتی ہے۔ اس کے پاس ذات پات کی تمیز نہیں، مشرق، مغرب کی تفریق نہیں۔ رنگ روپ، مذہب ایمان، اونچ نیچ کا سوال نہیں۔ جس نے علم کی پوجا کی وہ اس کی دعا قبول ہوئی۔ غرض ہر تدبیر سے سرسید کو یہ سمجھانا پڑا کہ مسلمان تعلیمی معاملات میں تعصب سے کام نہ لیں۔ انھوں نے اپنی ہی برادری کی غیر اقوام یعنی ہندوؤں کی مثال دی کہ وہ کیسے یوروپی علوم و فنون کو اپنا کر ترقی کی منازل پر گامزن ہیں۔ ان کا ماضی بھی ہمارے ماضی جیسا ہی شاندار تھا لیکن وہ تغیر سے اس قدر جلد ہم آہنگ ہو گئے کہ جب مسلمان یہاں آئے تو انھوں نے فارسی اور اردو سیکھی اور اب جو انگریز مسلط ہیں تو وہ انگریزی سیکھ کر سرکار دربار، صنعت و حرفت، تجارت، علوم و فنون، ہر جگہ سرخروئی حاصل کر رہے ہیں اور مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ہندو قلی کی مزدوری کر کے اپنے بچے کو پڑھاتے ہیں لیکن مسلمان کو ماچس کے خرچ سے بھی پیسہ نہیں بچتا کہ بچہ کی تعلیم ہو۔ بس یہ پڑھے لکھے خاندانوں کے بچے بھی ناخواندہ ہی رہ جاتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو اپنی شان بحال رکھنی مقصود ہو تو مغربی تعلیم ناگزیر ہے۔

دوسری مشکل کا جواب سرسید نے یوں دیا کہ یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کی آمد سے سب سے زیادہ مالی و جانی نقصان مسلمانوں کو ہی ہوا۔ لیکن ایک صد سال میں بھی وہ انگریز کو شکست نہ دے سکے۔ اب کیا خاک امید ہے کہ حالات بہتر ہوں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ صلح کر لی جائے۔ ایک نہیں کئی جنگیں مسلمانوں نے لڑیں مگر فتح کا سہرا انگریزوں کے ہاتھ ہی رہا۔ اس لیے کہ ان کے ہتھیار ہمارے ہتھیار سے زیادہ تیز ہیں۔ ان کی حکمت عملی ہماری حکمت عملی سے کہیں زیادہ موثر ہے۔ ان کا نظام حکومت ہمارے نظام حکومت سے بہتر ہے۔ ان کا تمدن، ان کا سلیقہ، ان کا طریقہ، ان کی قابلیت، ان کا سوچ بچار، ان کا تجربہ، ان کی صنعت و حرفت، ان کی تجارت و سفارت، سب کچھ ان کے علوم و فنون کا نتیجہ ہے اور جب تک ان علوم و فنون سے ہم بھی واقف نہ ہوں، ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جب تک زبردست سے مقابلہ کیا جائے زیر دست پٹتا ہی رہے گا۔ اتنی مار کھانے کے بعد بھی مسلمان نہ سنبھلیں گے تو ان کا وہی حال ہوگا جو ہسپانیوں کے مسلمانوں کا ہوا یعنی صفحۂ ہستی سے مٹا دیے گئے۔ عقل یہی رائے دیتی ہے کہ ہم ہوش سے کام لیں۔ پچھلے زخموں کو کرید کے

ہی رہیں تو زخم اور گہرا ہوگا۔ مرہم پٹی لگائیں۔ مرض کا علاج کروائیں۔ اگر دوائی تلخ ہو تو اس سے نہ گھبرائیں۔ اگر مغربی طب کی دوائیں مریض کے حق میں مفید ہوں تو ان کو قبول کریں۔ ہمارے طب کی جڑی بوٹیاں بوسیدہ ہوگئی ہیں۔ ان کی ابھی تازہ ہیں۔ اُن کے رس کس سے اپنی صحت بحال کریں۔ ان کی تجارت کی منڈیاں مال سے بھری ہیں۔ ان سے خرید و فروخت کرکے منافع کمائیں۔ ان کے درس و تدریس کے طریقے نرالے ہیں۔ ان کی تجربہ گاہیں عمدہ ہیں، ان کے دارالعلوم شاندار ہیں، ان سے سبق سیکھیں۔ غرض ہر لحاظ سے سوچا جائے تو یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپس کی مصالحت سے ہی مسلمانوں کی بہبودی ممکنات میں سے ہے۔ اگر مسلمان حقائق سے واقف نہ ہوں تو انگریز کا کچھ نہ بگڑے گا۔ مسلمان ہی خسارے میں رہے گا۔

تیسری مشکل مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ تہذیب سے اس کا رشتہ تھا۔ غیر زبان کو اپنانے میں اپنی زبان کو پیچھے دھکیلنا تھا۔ سرسید کو اس مشکل کے حل کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ مذہب کا مسئلہ نازک مسئلہ تھا۔ سرسید خود بڑے عالم تھے۔ انکی پالیسی پر اعتراضات کی جوابدہی کے لیے انھوں نے تصانیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''خطبات احمدیہ'' میں مستند طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ خالق نے صرف دینِ اسلام ایک ہی دین خلقت کو نہ بخشا تھا بلکہ آدم سے لے کر رسولِ عربی تک ہزاروں رسالت کے علمبردار ظہور میں آئے اور ہمارا ایمان سبھی رسولوں پر اور سبھی کتابوں پر ہے۔ اسی لیے یوروپی علوم و فنون کی تحصیل سے ہمارے مذہب کی بیگانگی کا سوال نہیں اٹھتا۔ بلکہ ہمارے مذہب کو صحیح طریقہ پر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ یوروپ کا طرز، فکر و تحقیق کی طرف مائل ہے۔ اس تحقیق سے ہماری کمزوریاں ہم پر عیاں ہوں گی۔ جیسا کہ مارٹن لوتھر نے عیسائی مذہب کی تصحیح کی تھی ویسے ہی ہمارے کئی توہمات، اعتقادات اور بدعات دور ہو سکیں گی۔ مذہب کو سمجھنے کے لیے بھی یوروپیائی ٹینڈ درکار ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزی پالیسی مذہب کے معاملے میں ایک دم غیر جانبدار ہو گئی ہے۔ اس نے ہر فرقہ و مذہب و ملت کو کھلی آزادی دے دی ہے کہ سرکار دین کے معاملوں میں کسی طرح کی مداخلت نہ کرے گی۔ انگریز کی یہ بڑائی تھی کہ وہ جلد تجربہ سے سیکھ جاتا تھا۔ غدر میں تھوڑی سی غلطی کی وجہ، جس سے ہندو و مسلمان دونوں کے مذہبی احساس کو ٹھیس لگی تھی، انگریز کا ہندوستانی تاریخ

اس کے سر سے چھنتے چھنتے رہ گیا اور اس نے اس غلطی کا کافی ازالہ کر دیا۔ کمپنی سرکار کا خاتمہ ہوا، وکٹوریہ ملکہ بنی اور اعلان کر دیا کہ مذہبی امور میں حکومت آئندہ کسی طرح کی بھی دست اندازی نہ کرے گی۔ سر سید نے ان حالات کو اپنی قوم کے ذہنوں میں اچھی طرح نقش کرانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

جب ان اعتراضات کا خاطر خواہ جواب دے دیا گیا تو دوسرا اقدام عمل کا تھا کہ کیسے مسلمانوں کی جہالت دور کی جائے۔ تعلیم پڑھانے سکھانے کا کیا انتظام کیا جائے، کہاں کیا جائے، کیسے کیا جائے، اس کے لیے کیا سہولتیں درکار ہیں، وہ کیسے دستیاب ہو سکتی ہیں، ان امور میں کس سے صلاح کرنی ہوگی وغیرہ کئی سوالات سر سید کے ذہن میں آئے اور یکے بعد دیگرے خود انھوں نے ان کا حل پیش کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کا ذہن تیار کرنا تھا۔ یہ مسلمان کچھ کچی مٹی کا تودہ نہ تھا کہ اس کو جس طرح چاہو موڑ لو۔ یہ بڑا ہٹیلا، ضدی، اولوالعزم انسان تھا جس کے ذہن میں بات کچھ دیر سے پہنچتی تھی۔ اس لیے سر سید ایک مدت تک تہذیب الاخلاق کے رسالے جاری کرتے رہے جس میں کوشش کوشش کر اس بات کو ذہن نشین کراتے رہے کہ اگر مسلمان نہ سنبھلے اور نہ بچے تو اس صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ سر سید کے تہذیب الاخلاق سے ایک حد تک وہی کام لیا گیا جو انگلستان میں ایڈیسن اور گولڈ اسمتھ نے (SPECTATOR -) سے لیا تھا۔ یعنی قوم کی اصلاح اور ان کی سماجی، اخلاقی، ذہنی اور تہذیبی نشوونما۔ اگر سر سید کا انداز فکر نرالا تھا تو ان کا انداز ذکر بھی ساحرانہ تھا۔ ان کی تحریروں سے ذہنی بھوک بڑھنے لگی۔ اس ذہنی بھوک کی اشتہا میں اور اضافہ کرنے کے لیے انھوں نے تہذیب الاخلاق اور سائنٹفک سوسائٹی کے علاوہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ ہر سال یہ کانفرنس کسی نہ کسی شہر میں منعقد ہوتی۔ مسلمانوں کا جم غفیر ہوتا۔ تعلیمی مسائل پر مباحثے ہوتے۔ بڑی بڑی تقریروں کے پلندے باندھے جاتے۔ قوم کی کس مپرسی کا گانا گایا جاتا۔ تدبیریں سوچی جاتیں اور اس طرح تعلیمی فضا کا ایک سماں باندھ جاتا۔ سر سید کی اس تدبیر سے بھی قوم کو بڑا فائدہ ہوا۔ اللہ کا شکر کہ مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا سلسلہ سر سید پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ آج بھی زندہ ہے اور قوم کے چند بہادر سپوت آج بھی اس کی بقا میں کوشاں ہیں۔

جب سرسید کو یہ اندازہ ہو گیا کہ زمین بیج بونے کے قابل ہو گئی ہے تو انھوں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے موسوم ہو کر شہرہ آفاق حالات کا حامل بنا۔ یہ ایک صرف کالج ہی نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھی جس سے مسلمانوں کی نئی زندگی مقصود تھی۔ یہ ایک منصوبہ تھا جس سے قوم کی سماجی، مالی، اخلاقی، سیاسی و تہذیبی حالت بہتر ہو۔ یہ مسلمانوں کی پستی دور کرنے اور انھیں بلندی پر لے جانے کا آلہ تھا۔ یہ مذہب و سائنس کے تضاد کو مٹانے کا حربہ تھا۔ یہ مشرق و مغرب کو ملانے کا ذریعہ تھا۔ یہ حاکم و محکوم میں رشتہ جوڑنے کا حیلہ تھا۔ یہ مسلمانانِ ہند کے تفرقوں کو مٹانے کا طریقہ تھا۔ یہ مغربی علوم کو مسلمانوں کے ذہنوں میں بٹھانے کا وسیلہ تھا۔ اس لیے علی گڑھ کو صرف ایک درسگاہ ہی تصور نہیں کر سکتے بلکہ وہ ظلمت کی فضاؤں میں روشنی کا ایک مینار تھا۔ حالی نے صحیح تصویر کھینچی ہے۔

"جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کر رکھ دیا
تا کہ پردیسی و راہ گیر کہیں کھائیں نہ چوٹ — راہ سے آسان گزر جائے ہر چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے — روشنی جن کی رہی محلوں میں ہی محدود سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا"

علی گڑھ کو مغربی طریقے سے چلایا گیا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج کا یہ نمونہ تھا۔ مغربی علوم یہاں کا نصاب تھا۔ امید یہ تھی کہ یہاں سے تعلیم یافتہ ملک کے گوشے گوشے میں جا کر تعلیم کے چھوٹے چھوٹے مرکز قائم کریں گے۔ اس طرح جہالت دور ہوگی، تعلیم عام ہوگی اور خوشحالی نصیب ہوگی مگر سرسید کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ بن سکا۔ ہوا یہ کہ علی گڑھ کے گریجویٹ، کلکٹر، کمشنر، جج، وکیل، عملدار، تحصیلدار وغیرہ وغیرہ بننے لگے۔ اپنی حالت بہتر بنانے لگے مگر دوسروں کا خیال ان کے ذہن میں نہ آیا۔ انگریز نے پھر علی گڑھ سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ یہاں کے تعلیم یافتہ انگریزی سرکار کے وفادار پرزے ثابت ہونے لگے۔ انگریزی اقتدار کی مشنری اور مضبوط ہونے لگی۔

وہ اب تک ہندوؤں کو اچھالتے رہے اور انھیں کی مدد سے ہندوستان میں برطانیہ کے قدم مضبوطی سے جمے رہے تھے اب اس کام کے لیے مسلمان بھی حاضر تھے۔ تنگ دستی، دہشت، غربت اور جہالت کے غار میں ملازمت کی ایک کرن ان کے لیے باعثِ رحمت بن گئی۔ قوم کو کچھ تو فائدہ ہوا۔ چند افراد ہی سہی، ان کی حالت بدلی۔ لیکن جو انقلاب مقصود تھا وہ نہ ہوا۔

اس میں سرسید کی غلطی نہیں تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ دوسروں کے دلوں میں بھی وہی درد موجود تھا جو ان کے دل میں موجزن تھا۔ انھوں نے زمین ہموار کی، ہل جوتا، بیج بوئے۔ فصل تیار ہوئی تو خیال تھا کہ اس سے ساری قوم مستفیض ہوگی۔ لیکن صرف چند جو اس میدان میں آئے ان کو ثمرات ملے۔ باقی سب محروم رہے۔ یہاں بھی انگریز موجود تھے۔ انھیں تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی تھی۔ مسلمان طلباء کے ذہن اس طرح ڈھلنے لگے جس سے غیر ملکی اقتدار کا فائدہ تھا اور وقت پڑے تو مسلمان نوجوان حکومت برطانیہ کی بقا کے لیے سینہ سپر ہو کر اپنی جان دے دے۔ اس طرح علی گڑھ تحریک نے اگر مسلمانوں کو خواب خرگوش سے جگایا تو ان کی چال بھی اس شاہراہ پر موڑ دی جہاں انگریزوں کا مفاد زیادہ اور مسلمانوں کی بھلائی کم تھی۔

پھر بھی علی گڑھ کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ توقع بے جا ہے کہ صدیوں کی غفلت اور ظلمت یک دو برس میں دور ہو جائے گی۔ یہ ہو سکتا تھا اگر چراغ سے چراغ جلتا اور ہر جگہ علی گڑھ تحریک اپنی اصلی حالت میں کارفرما ہوتی۔ قوم کے سردار میں قابلیت تھی، جذبہ تھا، ہمت تھی، عقیدہ تھا اور امید تھی۔ مگر کوئی جنگ اکیلے سردار کی ہمت سے ہی جیتی نہیں جاتی۔ اس کے لیے فوج کی تائید بھی ضروری ہے۔ سب کی قوت سے ہی فتح نصیب ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی جو کچھ علی گڑھ کر سکا وہ قابل تحسین ہے۔ وہ چھوٹی سی کشتی ہی سہی گرتے والوں کو سہارے کا ذریعہ تھی۔ یہ نوح کی ناؤ تھی جو اس میں آیا سلامت رہا۔ یہ موسیٰ کی لاٹھی تھی جس نے اس کو پکڑا، کامیاب رہا۔ مسلم ہندوستان میں ایک مدت تک علی گڑھ ہی ایک ایسا واحد مسلم ادارہ تھا جہاں مسلم بچوں کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام تھا۔ جہاں سے مشرقی علوم کی بھی ترویج ہوئی، مغربی علوم سے بھی فیض پہنچا۔ غور و فکر کا مادہ بھی ابھرا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ تحقیق و تفتیش کا چسکا بھی لگا۔ درس و تدریس کا چرچہ بھی رہا۔ تہذیب و تمدن اور اسلامی معاشرہ میں مغربی تہذیب کا نمونہ بھی نظر آنے لگا۔ اور سب سے بڑھ کر احساس کمتری کے داغ کو دھونے کا واحد وسیلہ بنا۔

سرسید کی علمی و تہذیبی خدمات کی اہمیت تعلیمی خدمات سے بھی زیادہ ہے۔ اس لیے کہ ان کے علم و فضل اور تحقیقات سے ہی قوم کا ذہن تغیر کی طرف راغب ہوا، دنیا کا سب سے اہم انقلاب ہے۔ سرسید اپنے ذہنی انقلاب کی وجہ سے ایک بڑے محقق ہو گئے۔ ان کی تحقیقات

کا سلسلہ وسیع تر ہونے لگا۔ تہذیب و تمدن، مذہب، معاشرت، سیاست، اخلاق، تعلیم، تربیت، سائنس، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ان کا تسلط رہا اور کئی جواب میں تو وہ موجد بھی بن گئے۔ وہ اور ان کے رفقائے کار مسلمانوں کے علمی شعور میں وہ نمایاں تبدیلیوں کا باعث بنے کہ عالمی سطح پر ان کی افادیت کا اعتراف ہونے لگا۔ سرسید خود ان تحقیقات، انداز خیال طرز تحریر، جدت موضوع، اور سیر بحث تشریحات کے امام بنے اور ان کے رفقائے کار جیسے الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے ہمارے ادب اور علوم میں گویا چار چاند ہی لگا دیے

سرسید کی کئی تصانیف ہیں۔ غدر پر بھی ان کی تین مستند کتابیں ہیں "بجنور میں غدر کی تاریخ" "اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۸ء" "ہندوستان کے وفادار مسلمان" ان میں اتنا مواد بکھرا ہے کہ اس زمانے کے صحیح حالات جاننے کے لیے یہ تینوں کتابیں ازبس ضروری ہیں۔ مگر سرسید کا علمی کارنامہ کسی اور ہی میدان میں تھا۔ ایک مدت تک ان کا ذہن اس کاوش میں لگا ہوا تھا کہ کیسے مغربی تہذیب کے جملہ عناصر اسلامی تہذیب میں پیوست ہو سکتے ہیں۔ مذہب اسلام پر عیسائی مشنریوں کے حملوں کا کیسے منہ توڑ جواب دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی عقائد کا معتزلہ نظریہ کے تحت کیسے عقلی جواز پیدا کیا جا سکتا ہے اور عیسائی مذہب کے اخلاقی پہلو جیسے ہمدردی و محبت کو اسلامی اخلاقی پہلو جیسے اخوت و مساوات و انسانیت سے کیسے جوڑا جا سکتا ہے ان کا مقصد مختلف مذاہب میں باہمی اتفاق پیدا کرنا، انسانیت کے جذبے کو ابھارنا، اختلاف کو مٹانا اور امن عامہ کا قیام کرنا تھا جس سے ہر فرد کو خوشحالی نصیب ہو اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس کے لیے مذہب اور سائنس کے تضاد کو دور کرنے کی ایک اہم مہم انھوں نے اپنے سر لی۔ سرسید سے پہلے مسلمان مغربی سائنسی تجربات اور مغربی عقلی زاویہ نگاہ سے ناواقف تھے۔ سرسید نے انتہائی کوشش سے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مذہب اسلام اور سائنٹفک اصول میں تضاد نہیں بلکہ مذہب اسلام آئین فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہ کام انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ کیا۔

"سیرت رسول" ان کی پہلی کتاب تھی جس میں آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ پر غائرانہ نظر ڈال کر عقلی ثبوت سے مشنریوں کے حملوں کا جواب دیا گیا تھا۔ انھوں نے انگریزی میں بھی ایک کتاب رسول اکرمؐ کی زندگی پر تصنیف کی مگر ان کی سب سے اہم تصنیف——

"خطبات احمدیہ" ہے۔ سر ولیم میور کی کتاب میں رسول اکرم ؐ کی ذات پر جو اعتراضات کیے گئے تھے، اس کا منہ توڑ جواب خطبات میں دیا گیا ہے۔ ایک اور اہم تصنیف "راہ سنت و راہ بدعت" ہے جو معتزلہ نظریہ کی حمایت کرتی ہے جو بعد میں "اخوان الصفا" میں نظر آتا ہے۔ سر سید شاہ ولی اللہ کے نظریہ سے اتفاق کرتے ہیں۔ سر سید کی مذہبی تصانیف میں قرآن مجید کی تفسیر بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی "آثار الصنادید" ایک مستند کتاب ہے جس میں دہلی کے قلعہ جات، محلات، اور دیگر عمارت کا سلاطین دہلی سے کر منشوں کے زمانے تک، اردو میں سب سے پہلا اور سب سے عمدہ تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب الاخلاق اور تحریری اور سائنٹیفک سوسائٹی کا اجرا کر کے سر سید نے قوم پر احسان عظیم کیا ہے۔

ایک لحاظ سے مارٹن لوتھر کے جو احسانات عیسائی مذہب پر ہیں اسی قسم کے احسانات سر سید کے بھی مذہب اسلام پر ہیں۔ یعنی مذہب کو صرف اعتقاد کے بل بوتے تسلیم نہ کر لیا جائے بلکہ وہ قدرت کے قانون کے مطابق ہو، عقل بھی مان لے، سائنس سے بھی جھگڑا نہ ہو، فطرت سے بے تعلق نہ ہو، حقائق سے تجرید نہ ہو اور ہر ذی شعور کی قبولیت کے لیے تکلیف دہ نہ ہو۔ مذہب اسلام کے عقیدوں میں گنتی کے صرف چند ایسے مسائل ہیں جو غیروں کو بحث کی گنجائش فراہم کرتے ہیں۔ ایک تو وحی و الہام ہے، دوسرا معراج تیسرا معجزہ چوتھا جنت دوزخ، پانچواں جن و ملائک اور چھٹا جہاد۔ سر سید نے ان مسئلوں پر کافی روشنی ڈالی ہے اور عقلی دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مسئلوں کے کس حصہ پر اعتقاد ٹھیک ہے اور کس حصے پر ٹھیک نہیں۔

سب سے پہلے انھوں نے مذہب کی تشریح کی ہے۔ ان کے نزدیک مذہب اخلاقیات کا ایک گلدستہ ہے، نیک عمل کا ایک راستہ ہے، قدرت کو سمجھنے کا ایک وسیلہ ہے، کائنات کو جانچنے پرکھنے اور اس سے مستفیض ہونے کا ایک ذریعہ ہے۔ فرد کی زندگی مفید، صاف اور پاک بنانے کا ایک گر ہے۔ اگر مذہب کی یہ تعریف تسلیم کر لی جائے تو مذہب اور سائنس کا تضاد جاتا رہے گا۔ مگر مذہب میں مشکل اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ وہاں ایمان اور اعتقادات کا سوال بھی آتا ہے۔ سائنس کا جھگڑا وحدانیت اور رسالت جیسے بنیادی عقیدوں سے نہیں، کیونکہ سائنس بھی یہی کہتی ہے کہ بغیر سبب کے کوئی چیز ظہور پذیر

نہیں آتی اور یہ ساری کائنات اب جو ظہور میں آچکی ہے اس کا ضرور کوئی خالق ہوگا۔ وحدانیت
ہی سائنس کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قبول عقیدہ ہے۔ رسالت کا بھی کوئی جھگڑا
نہیں۔ کس کو انکار ہے کہ عیسیٰ یا رسول اکرمؐ پیدا نہیں ہوئے تھے، انھوں نے نیکی کا پیغام
نہیں دیا تھا۔ ان کی تعلیمات سے کس کو انکار ہے کہ ایک صالح زندگی کے لیے ان کا بتایا ہوا
راستہ موزوں نہیں ہے۔ لیکن سائنس کا جھگڑا وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں عقل کام نہیں
دیتی اور عقیدے پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے، مثلاً وحی و الہام۔ رسول اکرمؐ امی تھے وہ کیسے قرآن
جیسی ام الکتاب پیش کر سکتے تھے اگر وحی ان پر نازل نہ ہوتی؟ یہاں سائنس والے گھبرا جاتے
ہیں۔ مذہبی دلائل سے، انھیں تشفی نہیں ہوتی اور انھیں اسلام کے اس وحی کے عقیدے پر
چوٹ کرنا آسان معلوم ہوتا ہے۔

سرسید وحی کے مسئلے کو یوں سمجھاتے ہیں کہ وحی ذہنی فطرت کی وہ اصلی جھلک ہے جو اب
تک حقیقتوں کے پردے میں پنہاں تھی لیکن ایک صاحب کمال کے ذہن میں فوراً عیاں
ہوگئی۔ ذہنی انقلاب جہاں حقیقت کے پردے فاش ہوتے ہیں، وحی ہے۔ راز حیات
کی تجلی جو فوراً ذہن میں چمک اٹھتی ہے، وحی ہے۔ صالح نظام زندگی کی لہر جو فوراً دماغ میں
دوڑ جاتی ہے، وحی ہے۔ کائنات کے ربط و ضبط کے اصول جب انسانی شعور پر فوراً واضح
ہو جاتے ہیں تو الہام کا مقام آتا ہے، یوں کہ ساری باتیں، راز حیات، صالح نظام
زندگی، کائنات کا ربط و ضبط سب حقیقتوں پر منحصر ہے انھیں کا صحیح علم وحی سے عبارت
ہے۔ وحی حقائق پر مبنی ہے اس میں سچائی کا راز مضمر ہے۔ وہ قدرت کے قانون کے تابع
ہے۔ وہ فطرت کے آئین سے مطابقت کرتی ہے کائنات میں ہر شے ایک ربط سے قائم
ہے ہر شے کا دیگر شے سے ایک اندرونی رشتہ موجود ہے۔ اس کے چند اصول معین ہیں
اور یہ اصول انسانوں میں جو اعلا و ارفع دماغ رکھتے ہیں ان پر عیاں ہو جاتے ہیں۔ یہ خالق
کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں جو رسول یا پیغمبر یا ہادی یا راہبر کہلاتے ہیں۔ لیکن ان کی
تعلیمات فطرت، قدرت، حقیقت سے علاحدہ نہیں ہوتیں۔ اسی لیے سرسید وحی کو عقل
سے بالاتر چیز نہیں سمجھتے تھے۔ یہ دماغ کا خاصہ ہے کہ کسی بھی مشکل امر کا حل مدتوں کی تلاش
کے باوجود سوجھائی نہیں جاتا، لیکن کبھی کبھی آن واحد میں جس کو ذہنی لہر (BRAT[illegible]UJE)
کہتے ہیں فوراً اس کا حل سمجھ میں آجاتا ہے۔ پرسوں رسول اکرمؐ کا کائنات کے [illegible]

بنیادی اصولوں پر غور و فکر فرماتے رہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن ایک دن غار حرا میں یوں محسوس ہوا کہ سینہ وا ہو کر اس میں علم کے موتی کوئی پرو رہا ہے۔ دماغ کی اس کیفیت کو سرسید وحی سے تعبیر کرتے ہیں۔

عقیدے سے ملی ہوئی دوسری بات یہ ہے کہ وحی جبرئیل کے ذریعہ نازل ہوئی۔ سرسید کو جبرئیل کی شخصیت سے اتفاق نہیں۔ وہ جبرئیل کا نام اس کیفیت سے مترادف کرتے ہیں۔ جہاں فوراً ذہنی لہر دوڑ گئی تھی۔ شاعر لوگ شعر کہنے کے لیے طبیعت کی آمد کا ذکر کرتے ہیں، یہ بہت جلی کرن ہے، اس آفتاب کی جہاں سے حقیقت کے پردے فاش ہوتے ہیں۔ یہ شرر ہے اس شعلہ کا جہاں سے اسرار کائنات عیاں ہوتے ہیں مگر صفات میں مناسبت ہے۔ جب ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارا خالق ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر ہے اور جب رسول کریم نے خود کہا تھا کہ میں تم جیسا ہی بشر ہوں تو سرسید کے نزدیک غیر عقلی ملائک کے درمیانی دخل کی گنجائش نہیں۔ سرسید ملائک اور جن وغیرہ کو بھی نہیں مانتے اس لیے کہ ان کا وجود عقل سے ثابت کرنا دشوار ہے۔ مگر وہ مانتے ہیں کہ وحی یا الہام وہ قدرتی ہدایتیں ہیں جو نہایت ہی برگزیدہ ہستیوں کو جو انسان کامل بن چکے ہیں اپنے اعمال صالح اور تخلیقی مادہ کی وجہ سے نصیب ہوتی ہیں علم عرفان کے ان حصوں کو اس زمانے کی سمجھ کے مطابق وحی کا نام دیا گیا تھا اور اس علم کے حصول کے وقت جو رقت و کیفیت طاری ہو جاتی تھی اس کو جبرئیل سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یہ سرسید کا خیال ہے۔

سرسید جسمانی معراج کے قائل نہیں۔ معراج کو خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے اس عقیدے پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ قدامت پرست لوگ بہت ناراض ہوئے۔ کفر کے فتووں کا انبار لگا۔ لیکن سرسید اپنے عقیدے پر مصر رہے، اس لیے کہ معراج سے متعلق جتنے بھی عقیدے تھے عقل و شعور کی جو کسوٹی میں نہیں سما سکتے تھے۔ معجزوں کے بارے میں بھی ان کا یہی خیال تھا کہ کوئی چیز جو قانون قیاس نہیں، ممکن نہیں، رسول اکرم ہمیشہ اپنے آپ کو "انا بشر مثلکم" یعنی میں تم جیسا ہی بشر ہوں کہتے تھے۔ اس لیے سرسید کے نزدیک معجزوں کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ خوش قسمتی سے اسلام میں معجزوں کا طومار نہیں ہے۔ بالکل کم ہے اور نہ ہونے کے برابر ہے۔ حضرت عیسےٰ کا مردوں کو زندہ کرنا۔ برص کے مریض کو اچھا کرنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کا اژدہا بننا، کوہ طور پر

تجلی اور اللہ سے کلام کرنا۔ حضرت سلیمان کا جانوروں کی بولی سمجھنا اور ان کے تخت کا ہوا میں اڑنا، حضرت یونس کا مچھلی کے پیٹ سے صحیح سالم نکلنا، حضرت ابراہیم کے لیے آگ کا گلزار بن جانا اور ایسے ہی دیگر پیغمبروں کے اعجاز رسول اکرم کی زندگی میں ظہور پذیر نہیں ہو سکے۔ سر سید کا کہنا ہے کہ یہی اسلام کی سب سے بڑی بڑائی و بزرگی ہے کہ جہاں عقل سلیم سے پرے کسی بھی اعتقاد پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اہم معجزہ شق القمر ہے۔ سر سید اس کو بھی نہیں مانتے۔ اس لیے کہ ظہور اسلام سے رسول اکرم کی رحلت تک دشمنان اسلام کا یہ رویہ تھا اور رسول اکرم کو کس قسم کی سختیاں سہنی پڑیں۔ کتنی جنگیں لڑنی پڑیں اور کیا کیا ہونے سے تجربے پیش آئے سب تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہیں۔ جو پیغمبر۔ پیغمبروں کے امام تھے، جو رسول ہمارے رسولوں کے سردار تھے اور جو نبی سب نبیوں کے تاجدار تھے، اگر چاہتے تو دیگر پیغمبروں سے بڑھیا معجزے پیش کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور دندان مبارک شہید ہوا۔ معجزے سے کام لے کر فتح حاصل نہیں کی گئی۔ صبر و استقلال سے کام لے کر عقل و شعور کو کام میں لایا گیا اس لیے سر سید کے پاس معجزے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عربی زبان میں اعجاز یا معجزہ کو کمال کی صفت سمجھا گیا ہے۔ لیکن وہ کمال عقل و شعور سے بالاتر نہیں۔

چوتھا مسئلہ جنت دوزخ کا ہے۔ یہاں بھی سر سید کا رجحان عقل کی طرف مائل ہے۔ جنت دوزخ کا نقشہ جو ہمارے مولوی صاحبان کھینچتے ہیں، اس سے کچھ اتفاق نہیں۔ جنت دوزخ دنیا میں ہی پیش آجاتی ہے۔ بھلائی سے روح کو جو تسکین ہوتی ہے وہی جنت ہے اور برائی سے ضمیر کی ملامت جو ہوتی ہے وہی اہل شعور کے نزدیک دوزخ ہے۔ سر سید کا کہنا ہے کہ روح لاموت (IMMORTAL) ہے۔ اس کی خالص اصلیت (ESSENCE) ہمیشہ زندہ رہے گی اور سزا و جزا کی مرتکب ہوگی۔ اچھے کاموں کی وجہ سے جسم چھوڑنے کے بعد بھی راحت و فرحت میں رہے گی اور برے کاموں کی وجہ سے بے چینی میں رہے گی۔ یہ فطرت کا قانون ہے کہ نیکی و بدی کا حساب ہو۔ اگر اچھے کام کا صلہ آج نہ ملے گا تو کل ملے گا اور بدی کی سزا آج نہیں تو کل ملے گی۔

پانچواں مسئلہ جن و ملائک کا ہے۔ سر سید اس عقیدے پر بہت چوٹ کرتے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ جن و ملائک عوام کو بھلائی یا بُرائی کی صفت کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اشیاء کی خاص صفت یا خصوصیت کو وہ فرشتوں سے تشبیہ دیتے ہیں کوئی نیک انسان ہو تو اس کو فرشتہ خصلت کہتے ہیں۔ ہر زبان میں تلمیحات و تشبیہات ہوتے ہیں جو اعلیٰ خیال کے اظہار کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں پتھر اور لوہے میں سختی کی صفت ہے جو بظاہر نظر نہیں آتی۔ پانی میں بہاؤ کی صفت ہے۔ آگ میں جلانے کی صفت ہے۔ سورج میں روشنی کی صفت ہے۔ اگر وہ صفت افادیت پر مائل ہو تو فرشتہ خصلت ہوگی اور اگر بُرائی کی طرف مائل ہو تو جنات کی طرف مائل ہوگی۔ سانپ و بچھو میں زہر ہے، گندگی میں تباہ کرنے کی خصوصیت ہے۔ آگ میں جلانے کی خصوصیت ہے۔ ایسی خصلتیں جنات سے تعبیر کی گئی ہیں۔

جہاد کے مسئلہ پر ان کا خیال تھا کہ جہاد صرف مدافعت کے لیے جائز ہے۔ جہاد کے معنی جدوجہد اور کوشش کے ہیں۔ یہ کوشش جنگ کے میدان میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں بھلائی اور ترقی کے مدنظر جاری رکھی جائے تو وہ اسلامی جہاد ہوگا۔ جہاد ہر کام سے انتہائی عشق کا نام ہے۔ انسانوں کو عمل پر گامزن کرنے کی غرض سے اسلامی اصول کو مذہبی فرائض کا رنگ دے دیا گیا ہے۔ تاکہ ترقی کی شاہراہ وسیع ہو جائے۔ لیکن ہمارے تقلیدی بزرگ ان کی صحیح تشریح سے گریز کرتے ہوئے معنوی تفصیلات میں پھنس کر ان اصول کے صحیح مقاصد سے عوام کو دور کرتے جاتے ہیں۔ سرسید کے نزدیک جہاد کے معنی حقائق کی انتہائی تلاش ہے۔

سرسید کا خیال تھا کہ ارتقاء کے نظریہ کا جواز اسلام میں موجود ہے۔ فارابی کا سارا فلسفہ اسی پر منحصر ہے ہر چیز دوسری چیز سے ربط رکھتی ہے اور ہر چیز اپنی نشوونما کے لیے ہر دوسری چیز کی محتاج ہے۔ ارتقاء (EVOLUTION) کا مسئلہ قرآن میں بھی موجود ہے۔ تخلیق بتدریج عمل میں آئی۔ ہوا، پانی، مادہ، جمادات، نباتات، حیوانات اور سب سے آخر میں انسان جو تخلیق کی معراج ہے سلسلہ وار ظہور میں آئے پچھلی جتنی بھی تخلیق ہوئی اس کے سارے آثار انسان میں موجود ہیں۔ اس کا سانس ہوا کا، اس کے خون میں پانی کا، اس کی ہڈیوں میں مادہ کا، اس کے اگنے اور بڑھنے میں جمادات کا، اس کے چلنے پھرنے کھانے پینے میں حیوانات غرض ہر تخلیق کا وہ مظہر ہے۔ اس کے علاوہ فطرت کی کئی اور خصوصیات اس میں موجود ہیں شبنم کی نمی جیسا پیار، شہد کی مٹھاس جیسی الفت، گلاب

کی خوشبو جیسا رحم و کرم، سورج کی روشنی جیسا فہم وذکا، پرندوں کی طرح اڑنا، مچھلی کی طرح تیرنا، بجلی کی طرح چمکنا، سب کچھ اس کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ بھڑکتی ہوئی آگ جیسا غصہ، سانپ کے زہر جیسی عداوت، بندر جیسی شرارت، لومڑی جیسی عادت، بھیڑیے جیسی سفاکی، شیر جیسی خونخواری یہ سب بھی موجود ہیں جو ارتقا کے کئی منازل سے گزر کر انسان میں پیوست ہو چکے ہیں۔ ہم مانتے ہیں "جانور، آدمی، فرشتہ، خدا، آدمی کی کئی ہیں قسمیں" یہ انسان پر منحصر ہے کہ خالق کی خدائی سے نکل کر جانور کی طرف چلا جائے یا جانور کی قسمت سے ترقی کرتے کرتے قدرت کی خدائی پر آجائے۔ مذہب کا منشا ہے کہ آدمی جانور سے فرشتہ بن جائے اور فرشتے سے انسان "فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا! مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ"۔ مذہب کا کام حیوانی خصلتوں سے انسان کو پاک رکھ کر اخلاقی خصلتوں کا چراغ اس کے دل و دماغ میں روشن کرنا ہے۔

سرسید نے اپنی تفسیر قرآن میں اسلام کے دس بنیادی اصول بتائے ہیں جن پر ان کا پکا عقیدہ تھا۔ وہ یہ ہیں۔ پہلا کلمۃ الحق، وحدانیت اور ربوبیت، دوسرا اخلاق کا علم وکرم اور ہدایت تیسرا قرآن پر یقین کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ وہ وحی کے ذریعے نازل کیا گیا ہے۔ چوتھا وحی و الہام کی تفہیم جو ذہنی لہر کے ذریعہ دل میں آئی اور جس کی تفصیل اور بیان کی جا چکی ہے۔ قرآن میں جو بھی تاریخی تذکرے آئے ہیں وہ صحیح ہیں اور مستند ہیں، چھٹا ذات الٰہی کی صفات قرآن میں جو درج ہیں وہ صفات کسی تخلیق شدہ ذات کے اندر موجود نہیں بلکہ صفات خود بنا تو اپنا وجود آپ رکھتی ہیں، ساتواں یہ صفات ازل سے ابد تک ہیں اور لایموت ہیں، آٹھواں، احکام الٰہی فطرت کے قوانین سے جدا نہیں، نواں رسول کریم پر الہام بتدریج نازل ہوا اور یہ نہیں کہ سارے کا سارا قرآن بہ یک وقت وارد کر دیا گیا، دسواں، مختلف زبانوں کی تحقیق و تفتیش ضروری ہے تاکہ عربی زبان کے محاورات، استعارات اور تشبیہات کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکے اور چند پیچیدگیاں دور ہو سکیں۔

سرسید کے ان دس اصولوں میں سوائے دو کے کسی اور پر نکتہ چینی کی گنجائش نہیں۔ ان اصولوں پر ہر مسلمان کا عقیدہ پکا ہے۔ اگر ان اصولوں کو مان لیا جائے تو اسلام سے بڑھ کر اور کوئی مذہب فطرت اور عقل کے قریب نہیں آ سکتا۔ یہ سارے اصول ابن فطرت کی مطابقت کرتے ہیں اور عقل و شعور پر مبنی ہیں۔ لہٰذا دین اسلام حقائق پسند دین ہے۔

جس میں توہمات، رسومات و تقلیدات کی گنجائش نہیں۔ ہر مسئلہ پر عقل و شعور کی روشنی میں جانچ پڑتال جائز ہے۔ چونکہ سرسید کی کوشش مذہب اسلام کو قدرت کے قوانین اور فطرت کے آئین کے قریب تر لانا مقصود تھا، ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ نیچری یا فطری ہیں۔ یہ الزام اس حد تک صحیح ہے کہ وہ اسلام کو فطرت کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے ہیں، عقل کی کسوٹی پر جانچنا چاہتے تھے، بے جا توہمات سے پاک رکھنا چاہتے تھے، اس کے پوشیدہ راز فاش کرنا چاہتے تھے اور اسلام کو اغیار کے حملوں سے بچانا چاہتے تھے۔

الغرض سرسید کے احسانات سے قوم کا سر جھکا جاتا ہے۔ اگر ان کی قیادت نصیب نہ ہوتی تو شاید مسلمانان ہند صدیوں پیچھے رہ جاتے۔ ان کی خدمات صرف تعلیمی میدان میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں فیض رساں ثابت ہوئیں۔ علی گڑھ تحریک سے بیداری کی وہ لہر دوڑ گئی کہ مسلمان زندگی کا ثبوت دینے لگے۔ اخلاقی، سماجی، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی، دینی اور مذہبی معاملات میں ان کی قیادت سے وہ روشنی پیدا ہوئی جس سے مسلمان انسان کہلانے کے مستحق بنے۔ تقلیدات، توہمات، رسومات، خرافات، تعصب اور جہالت میں وہ ایسا پھنسے تھے کہ اگر ان کی بیماریوں کا نشتر سے علاج نہ کیا جاتا تو ان کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مسلمانوں کے پاس سوائے مذہب کے اور کچھ نہ تھا اور وہ مذہب بھی غیر عقلی عقیدوں کا ایسا شکار ہو چکا تھا کہ جس سے نقصان ہی نقصان کا اندیشہ تھا۔ کشتی بھنور میں تھی اور ایسے نازک وقت میں ایک مرد مجاہد، مدبر، مفکر، مصلح، ہمدرد و نیک مرد اپنی جوانمردی اور دانشوری سے کام نہ لیتا تو شاید مسلمانان ہند کا نام بھی داستانوں میں لکھنے کے قابل نہ رہتا۔

حالی کی انسانیت

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کا نام اس برصغیر کے کروڑوں انسانوں کے دل پر ادب و احترام کی مہر لگا چکا ہے۔ وہ ایک ایسے ہمدرد، پاک دل، پاکباز، دل صفت، فرشتہ خصلت، مفکر، مدبر انسان تھے جو صرف ساری دنیا کا درد ہی اپنے دل میں نہ رکھتے تھے بلکہ اس درد کا درماں بھی انھوں نے سوچ رکھا تھا جو ان کی تحریروں میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانانِ ہند کے زاویۂ نگاہ کو ایک اخلاقی اور انقلابی شاہراہ پر ڈال دینا تھا۔ یہ سرسید کے اس نظامِ شمسی کے ایک درخشاں ستارہ تھے جن کی علمی ادبی، سیاسی، سماجی، تعلیمی و تہذیبی چمک سے ایک نئی روشنی پیدا ہوئی تھی۔ اور ظلمت میں گھری ہوئی قوم میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور حالی وغیرہ سرسید کے ان رفقائے کار میں سے تھے جنھوں نے مسلمانوں کے اندر ایک نشاۃ ثانیہ کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ان بیش بہا خدمات کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا چراغ جو بجھنے والا ہی تھا، بھڑک کر پھر روشن ہو گیا۔ ان میں ہر ایک کا کارنامہ جدا جدا تھا، لیکن مشترکہ کمال یہ تھا کہ ہر شخص کی ذات سے اسلامی شان دوبالا ہو گئی۔ کوئی ادب کوئی سیاست، کوئی تعلیم، کوئی تربیت اور کسی نے شاعری کے میدان میں وہ جوہر دکھایا جو کسی بھی قوم کے لیے مایۂ ناز اثاثہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ان سب کی کوشش تھی کہ تہذیب اسلامیہ جو ماضی کی ایک شاندار امانت تھی موجودہ نسل کی غفلت کی وجہ سے کہیں دفن نہ ہو جائے۔ انھی بزرگوں کا طفیل ہے کہ ہندوستان میں ملتِ اسلامیہ پھر متحد دکھائی

کے قابل ہیں۔

حالی کا میدان شاعری میں نئی روح پھونکنا تھا۔ عشق و عاشق، گل و بلبل، ہجر و وصل سے ذکر سے ہٹ کر کائنات کے بھید تذکرے اس میں سمونا تھا۔ قدرت کے مناظر پیش کرنا تھا۔ حساسات زندگی بیان کرنا تھا۔ انسانوں میں عقل و شعور کا جذبہ ابھارنا تھا۔ ماضی کے سنہرے خواب کی تعبیر مستقبل کے لیے حیل کرنا تھا، گرتی ہوئی قوم کو سنبھالنا تھا۔ اور اس میں وہ جوش و ولولہ بھرنا تھا جو دور گراں خوابی سے جگائے۔ عمل و تخلیق میں لگ جائے۔ حالات حاضرہ کو سمجھے، اعلا علوم و فنون میں حصہ لے اور اپنے مستقبل کو سنوارے وہ شاعری کی عظمت کو جانتے تھے اور اس سے قومی ترقی کے حصول کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

حالی کے ہم پر کئی احسانات ہیں۔ اولاً یہ کہ ہماری شاعری کے مردہ جسم میں انھوں نے روح پھونکی۔ ہماری شاعری کو فحش، ناپاک، خرافات اور گندے خیالات سے بالکل پاک کر دیا۔ اسے اصلاح، اخلاق، ادب اور فلسفہ کے سانچے میں ڈھال کر ہمارے ادب کی آبیاری کی۔ زبان کو مبالغہ آمیز الفاظ سے پاک رکھا۔ نہ اس میں عشق و عاشقی کی داستانیں نہ معشوق کی بے وفائی کا دکھڑا، نہ ہجر و وصال کے جھگڑے، نہ گل و بلبل کے تذکرے، نہ ناصحوں پر پھبتیاں اور نہ واعظوں پر صلواتیں۔ ہماری شاعری کو انھوں نے صرف جذباتی اور تخیلی دائرے سے نکال کر آفاقی مرتبہ عطا کیا۔ اس کو ایک نسخۂ کیمیا کا درجہ بخشا جو قوم کے مرض کو دور کرے۔ اس میں وہ جدت و ندرت بھر دی جس نے دین و دنیا دونوں سنبھلیں ساتھ میں ماضی کی وہ شان بھری جو ہر غیور کے لیے عمل کا ایک تازیانہ بنے۔ اس میں حالات حاضرہ کا وہ نقشہ پیش کیا جس سے ہر شخص کا دل ندامت و شرمندگی سے پانی پانی ہو جائے۔ اس میں علم و حکمت کے ایسے موتی پرو دیے جس سے ہر ذی عقل کا دل ہدایت کے چشمے سے سیراب ہو جائے۔ اس میں حق و صداقت اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری جس سے انصاف، راستبازی و ایمانداری کا پورا پورا حق ادا ہو جائے تہذیب و تمدن، اخلاقیات و انسانیت کا وہ سبق دہرایا جس سے شرافت و نجابت کا چہرہ پھر سے تازہ ہو جائے۔ غرض ہماری شاعری کو ایک نئی جان بخشی اور اس کو ایک نئے موڑ پر ڈال دیا۔ اخلاقی، اصلاحی، سماجی، تہذیبی اور انسانی احساسات

آئینہ بنایا فطرت کی غمازی کا آلہ بنایا۔ قدرت کی خوشنما تخلیق کا ترجمان بنایا۔ دکھ درد، خوشی غمی، محبت مروت، انسانیت و شرافت کا مخزن بنایا، اور ہماری شاعری کی شان میں اضافہ کیا۔

ان کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ علامہ اقبال سے پہلے اپنے ہی طرز میں اصلاحی روح کو جانا، پرکھا اور اسی طرح پیش کیا کہ عوام و خواص سبھی اس سے مستفیض ہو سکیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے مغربی فلسفہ سے کچھ واقفیت چاہیئے۔ مگر حالی کی دکان سو فیصدی مشرقی ہے یہاں بچے بچے صرف لطف اندوز ہی نہیں بلکہ عبرت، تکلیف حد تک متاثر بھی ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ اپنی کہانی حالی کی زبانی اس قدر معنی خیز ہوتی ہے کہ دل پھڑک اٹھتا ہے۔ حالی نے مسدس لکھ کر سرسید کو تڑپا دیا تھا اور یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ روز حشر خالق کے اس سوال پر کہ دنیا سے وہ کونسا عمل ساتھ لایا ہے جس سے اس کی بخشش ہو تو جواب عرض ہوگا کہ حالی سے مسدس لکھوا کے لایا ہوں۔

حالی کا ہم پر تیسرا احسان یہ ہے کہ ان کی تعلیمات میں انسانیت کو سماجی ذمہ بخشا گیا ہے۔ ذات پات کی تفریق کا کہیں ذکر نہیں۔ صرف اس بات پر زور ہے کہ

"یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"

وہ اخلاقی شخصیت کے حامی تھے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

وہ ساری خلقت کا درد اپنے سینے میں رکھتے تھے۔

ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

وہ ہمیشہ یاد دلاتے تھے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

ہمارے معاشرے میں سعدی کے بعد کسی نے اخلاقیات پر زور دیا ہے تو وہ حالی تھے۔

کرو علم سے اکتساب شرافت — شرافت سے ہے یہ نجابت زیادہ

ان کے پاس حقیقت کی فراوانی ہے۔

یہ جو زمانے سے بنتی نہیں — جو کچھ کاٹنا ہو تو بونا پڑے گا
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو — اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

ان کے ہاں ذات الٰہی کو سمجھنے کی کیفیت موجود ہے:

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا | باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جمال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ | ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جلال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی، گو گرانیں ہے طبیعی | جو حل نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
پھولے ہوئے ہیں گو کہ دل بند عقدہ ہائے | ملنے سے جی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

رسول اکرمؐ کی شان میں مسدس کے وہ اشعار، جو نعتوں میں رحمت لقب پانے والا، مرادیں غریبوں کی بر لانے والا - سے شروع ہوتے ہیں، جب شائع ہوئے تو سارے ملک میں دھوم مچ گئی۔ بچے بچے کی زبان پر وہ دہرائے جانے لگے۔ مجلسوں میں گائے جانے لگے جس سے عشق و رقت کا سماں طاری ہو جاتا تھا۔ مسدس واقعی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے جس میں اخلاقیات کا ایک سمندر لہرا رہا ہے۔ اور اسلامی عروج و زوال کا ایک حقیقی منظر پیش کر دیا گیا ہے۔

ہمدردی کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:-

خدا رحم کرتا نہیں اس بشر پر | نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
سکھائی انھیں نوع انساں پہ شفقت | کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت

اسلامی مساوات و اخوت کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا | نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی | زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

معیشت کے آداب یوں سکھاتے ہیں:

محبت سے دل ان کا گرما گیا جب | سماں ان پہ توحید کا چھا گیا جب
سکھائے معیشت کے آداب ان کو | پڑھائے تمدن کے سب باب ان کو
جتائی انھیں وقت کی قدر و قیمت | دلائی انھیں کام کی حرص و رغبت
نہ چھوڑے گا ساتھ ہرگز تمہارا | بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

علم کی توقیر یوں جتائی ہے:

انھیں کے لیے یاں ہے نعمت خدا کی | انھیں پر ہے واں جا کے رحمت خدا کی

گیا دورِ حکومت کا بس یہ گئی بازی ہے　　جہاں میں چار سو علم و فن کی ہے علمداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے، ہے معلوم یہ اُن کو　　کہ بے علم و ہنر جینا ہے فقط ذلت و خواری
جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے　　جدھر دیکھو تو پیچھے علم کے ساری خدائی ہے

ہمارے ہاں تفرقوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

ہمارے تفرقوں نے کر دیے تحلیل سب اجزا　　نہ باقی کہیں ترکیبِ قومی کا نشاں ہم میں

عقل کی اہمیت یوں بیان کرتے ہیں:-

کسی نے یہ اک مرد دانا سے پوچھا　　کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا　　کہا گر نہ ہو یہ تو اس سے انساں کو بہرا
کہا پھر ادب سب سے علم و ہنر ہے　　کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے
کہا گر نہ ہو اس کو یہ بھی میسر　　کہا مال و دولت ہو پھر سب سے بڑھ کر
کہا، ورنہ یہ بھی ہو گر بند اس پر　　اس پہ بجلی کا گرنا ہے بہتر
وہ ننگِ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے　　خلائق سب اس کی نحوست سے چھوٹے
مجھے ڈر ہے اے میرے ہم قوم یارو　　مبادا کہ وہ ننگِ بشر تمھیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو　　تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول راست آئے گا تم پر　　کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر

مسلمانوں کی عظمت و عروج کا نقشہ کس فخر و ناز سے کھینچتے ہیں:-

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے　　مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے　　خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

رسول اکرمؐ کی شان میں کہتے ہیں تو کس عقیدت، عقیقت، لطافت و شیرینی انداز میں:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا　　وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ　　یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا　　اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

انسانیت کا سبق کس موثر طریقے سے دیتے ہیں:۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا — کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

سر عبدالقادر جب یورپ گئے تو وہاں ہر جگہ لوگوں کی بڑھی ہوئی محنت کی اہمیت پر قصے انھیں نظر آئے۔ سر عبدالقادر نے بتایا کہ یورپ سے بہت پہلے حالی نے محنت کی اہمیت جتائی ہے۔ انھوں نے یہ اشعار پڑھے:۔

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری — جہاں دیکھئے فیض اسی کا ہے جاری
یہی ہے کلید در فضل باری — اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
اسی سے ہے قوموں کی یاں آبرو سب — اسی پر ہیں مغرور میر اور تو سب
گلستاں میں ہو جو بن گل و یاسمن کا — سماں زلف سنبل کی تاب و شکن کا
قد دلربا سرو اور نارون کا — رخ جانفزا لالہ و نسترن کا
غریبوں کی محنت کی ہے یہ تگ و دو سب — کیاروں کے جو ہیں یہ تازہ رو سب
وہ بوتے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی — کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی
مشقت کی ذلت جنھوں نے اٹھائی — جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی — فضیلت نہ عزت نہ فرمانروائی
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے — مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے
ہوا کچھ وہی جس نے یاں کچھ کیا ہے — لیا جس نے پھل بیج بو کر لیا ہے
کرو کچھ کہ کرنا ہی کچھ کیمیا ہے — مثل ہے کہ کرنے کی سب بدیا ہے

جب ان اشعار کا مطلب انھیں سمجھایا گیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان اشعار کا ترجمہ بھی ان کے ایوانات میں کندہ کرایا گیا۔ علم کی فضیلت یوں بیان کرتے ہیں:۔

یہ چرخ کا انجن ہے چلوانے والا — جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا — زمیں کے خزانے اگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا — یہی آدمی کو ہے بے پر اڑاتا
تمدن کے ایوان کا معمار ہے یہ — ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ — کہیں جنگجوؤں کا ہتھیار ہے یہ

دکھایا ہے بیچاد لیروں کو اس نے | بنایا ہے روباہ شیروں کو اس نے
دھنی کی ہے اب بچار سو حکمراں تھا | سیکھے اس نے زیرا رضی اور یہ تھی

شریفوں کی اولاد کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے | تباہ ان کی حالت بری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے | کسی کو بٹیریں لڑانے کی لت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی | مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی

غرض حالی کی شاعری ایک حساس دل کی شاعری ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے بخوبی واقف تھے۔ دوسروں کا دکھ درد اپنے تخیل اور فکر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتے تھے کہ اُن کی شاعری مصوری کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور سننے والے کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی و خوبصورتی سادگی و سلاست ہے۔ حقائق زندگی، علم و حکمت کے پوشیدہ راز، سنگین تجربوں کا نچوڑ، تہذیب و اخلاق کے اصول موتی، ان کے کلام میں اس سادگی اور دلکشی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ گویا چمن کی کلیاں ہیں جو بے تکلف کھلے جا رہے ہیں اور اپنی خوشبو سے ساری فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ اُن کی شاعری کا سرچشمہ خود ان کی شخصیت ہے، جو اخلاق حمیدہ و اوصاف حمیدہ سے پُر نور ہے۔ ان میں رحم و کرم، ہمدردی و انسانیت، محبت و الفت، ایثار و وفا شعاری اور شرافت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ گویا سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند۔ اس شرافت کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کا وہ خزانہ ان کے ذہن میں محفوظ تھا، اسلامی تہذیب کا وہ سنہرا باب ان کے دل پر نقش تھا اور حالات حاضرہ کی پستی کا وہ مایوس کن نقشہ ان کے دماغ پر کندہ تھا جو شعر کی صورت میں ابر رحمت کی طرح برستا تھا، برق باراں کی طرح گرجتا تھا اور تجلی نور کی طرح چمکتا تھا۔ وہ انسانیت کی اُن بلند چوٹیوں پر پہنچ گئے تھے جہاں انسان کامل کی علمداری شروع ہوتی ہے۔

حالی کا اہم اور جو تھا احسان یہ ہے کہ وہ صرف شاعری ہی میں نہیں بلکہ نثر کے میدان میں بھی اپنے خاص جوہر دکھا چکے ہیں۔ اُن کی "حیات جاوید" سر سید کی مہر اثر کا سوانح عمری ہے جس میں سارے حالات کا ایسا مفصل تبصرہ ہے جس سے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ اور پھر سر سید کی قیادت میں ڈوبتی کشتی کا ساحل سے

جا لگتا، انتہائی کمال و خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ مضامین حالی میں ایسے جواہر ریزے موجود ہیں جو ہمارے ادب کا انمول خزانہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان سب میں حالی کی بلند شخصیت، اخلاق کا اونچا معیار، تہذیب و تمدن کی تعمیر اور انسانیت کی اہمیت و ضرورت کا ہمیں کافی علم حاصل ہوتا ہے۔

غرض حالی کی شاعری و تصانیف صرف ہمارے ادب کا ایک گراں مایہ سرمایہ ہی نہیں بلکہ ہماری بقا کے لیے ہدایت کا ایک سرچشمہ بھی ہیں۔ ان میں انسانیت کی وہ قدریں موجود ہیں جو انسان کی تخلیق کا مدعا ہیں۔ ان میں اخلاقی شخصیت کا وہ جوہر موجود ہے جس کا حصول قدرت کا تقاضہ ہے۔ ان میں بلند خیالی و اعلا کردار کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں جو ہر صاحب کمال کے لیے باعث تقلید ہیں۔ علم و حکمت، فکر و ذکر، حسن تخیل و خلوص و گہرائی کی فراوانی کا وہ عالم موجود ہے کہ جس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ زندگی کا کوئی ساز نہ ہوگا کہ جو حالی نے نہ چھیڑا ہوگا۔ تہذیب، تمدن، مذہب، آزادی، غلامی، اخلاق، غربت، افلاس، بھوک، بے کاری، مایوسی، انقلاب، امید، عدم اتفاق جیسی حالی کے احساس دل سے گزر کر شاعری کے روپ میں ادب کا گلدستہ بن جاتے ہیں، زندگی کا ساز بن جاتے ہیں، خیالات کا رنگ بن جاتے ہیں، فطرت کا نقشہ بن جاتے ہیں، حقیقت کا آئینہ بن جاتے ہیں، اور انسانیت کا پرچم بلند کرتے ہیں۔

علّامہ اقبال کی بلندی

علامہ اقبال کا شمار نسلِ انسانی کی اُن ممتاز ہستیوں میں سے ہے جن کے کارناموں کی خوشبو رہتی دنیا تک مہکتی رہے گی۔ مفکر، مدبر، محقق، شاعرِ اعظم، عاشقِ رسول، اسلام کے پرستار، سامراجِ مغرب کے نقاد، سیاست کے رازداں، علم و حکمت کے علمبردار، رموزِ خودی و بیخودی کے موجد، وہ ایک ایسی لاجواب اور انمول شخصیت تھی جو ہزاروں سال کے بعد قدرت کی طرف سے عطا کی جاتی ہے "مت سہل انھیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں" وہ خود اپنے ایک شعر کے مصداق تھے۔ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے، بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا" وہ صرف آسمانِ علم و ادب ہی کے ایک درخشاں ستارہ نہیں تھے بلکہ دنیائے عمل، انقلاب، سیاست و قیادت، جدت و ندرت، اصلاح و تعمیرِ اخلاق، شخصیت و سماجی خدمت کے بھی امام تھے۔ بیسویں صدی کے دانشورانِ ہند کی صفِ اوّل میں ان کا نام آتا ہے۔ آپ کے فکر کی بلندیوں سے ایک مردہ قوم میں تازہ روح دوڑنے لگی۔ اُن کے شاعرانہ تخیل سے ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ اُن کی فلسفیانہ گہرائیوں سے قدرت کے راز فاش ہوئے۔ اُن کے تدبر و تفکر سے ایک اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ اُن کے قلم سے تہذیب و تمدن کے چراغ روشن ہوئے اور عالمِ اسلام کی سسکتی جان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

اقبال کا کلام کسی بھی صاحبِ نظر کے لیے آبِ حیات ہے۔ اس میں اسلامی روح آویزاں ہے۔ اس کی عظمت جرمن تحلیل سے جانچی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شے

میں ایک دفتر چھپا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت پہچاننے کے لیے اعلا دماغ چاہیے۔ ایٹموں کو توڑ کر بیش قوت پیدا کرنے کی صلاحیت صرف موجودہ زمانے کا سائنٹفک کرشمہ ہے گو کہ یہ ازل سے موجود تھے۔ ایک بے علم کو درخت کے سبز پتے معمولی چیز نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ حافظ شیراز کے لیے معرفت کردگار کے دفتر تھے۔ ایک باغبان کے علم کے لیے وہ قدرت کا کارخانہ ہے جہاں گندگی ہوا پاک ہوتی ہے۔ اسی طرح تعلیمات اسلام احتساب کائنات کا درجہ رکھتی ہیں۔ جرمن فہیم ودانا، نیٹشے ہو یا گوئٹے، ہیگل ہو یا شوپنہار، کائنات میں انسان احساسات پر کافی تحقیق کر چکا تھا۔ اقبال نے ان تحقیقات کی تہہ کو پہنچ کر اسلامی اصول کو جانچا اور پرکھا اور اپنے تاثرات کو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔ اسلامی خزانہ علم وحکمت کے جواہرات سے بھرا پڑا تھا لیکن ان کی قدر وقیمت اہل اسلام کے پاس کچھ کم ہی تھی۔ جب مغربی علوم کی گہرائیوں سے اسے دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ ان میں انمول موتی دفن ہیں۔ علامہ اقبال کا احسان ہے کہ یہ ہیرے اور موتی ان کے کلام کے شاہکار تاج میں نگینہ کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر کلام چاہے بانگ درا ہو یا بال جبریل، پیام مشرق ہو یا ضرب کلیم، زبور عجم ہو یا اسرار خودی و رموز بیخودی، جاوید نامہ ہو یا ارمغان حجاز، ایک بہترین تہذیب کے گہرے رنگ و بو سے معمور ہے۔ اس تہذیب کے چند عناصر کی تشریح جو انھوں نے کی ہے وہ یہ ہے: خودی، عمل، تخلیق، ترقی، قوت، عشق، آزادی، وجود، مادیت، اخلاقی مقصد حیات، تلاش حق، اور تغیر۔ ان عناصر پر اگر ایک ہلکی سی نظر ڈالی جائے تو ان کے کلام کی عظمت ہم پر واضح ہو جائے گی۔

اقبال نیٹشے کی تردید کرتے ہیں۔ نیٹشے کا "بشر اور فوق البشر" (MAN AND SUPER MAN) کا تصور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے جہاں اخوت ومساوات ہر قدم پر انسانیت کا درس دیتے ہیں۔ نیٹشے کہتا ہے۔ قوت، طاقت، زبردستی و مضبوطی سب کچھ ہے۔ عجز ونیاز، بندگی واطاعت کچھ نہیں۔ زندگی میں رحم وکرم کام نہیں آتے، جبر واقتدار سے ہی انسان ترقی کرتا ہے۔ قوم عوام کی تعداد سے بلندی پر نہیں پہنچتی بلکہ عقل وشعور، فہم وذکا، فراست ودور اندیشی کی اقلیت سے جو جسم میں ذہن کے مترادف ہیں۔ دنیا میں انصاف سے کام نہیں چلتا بلکہ قوت سے۔ جرمنی کا یہ فلسفہ سارے یورپی اقوام کی سیاست کا آئینہ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے ایشیا کے کئی ممالک ان کے قبضہ میں آ چکے تھے۔ اقبال نے ان کے

خلاف ملکاں؟ "ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو / اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا" انھوں نے مغرب کی عیاری کا صاف اظہار کر دیا۔

"ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے"

مشرق و مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے کہہ دیا "ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری / یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں" "تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے / حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں" انھوں نے انسانِ کامل کا تصور پیش کیا جس کی قوت نیت و اخلاق پر منحصر ہے۔ اقبال کا فوق البشر آسمان کی بلندیوں پر اڑتا ہے اور سمندر کی تہہ چھانتا ہے، خطرات سے کھیلتا ہوا ہے "نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر / تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر"

اقبال کے کلام میں خودی کا فلسفہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ خودی میں خود شناسی، خدا شناسی اور جہاں شناسی تینوں آجاتے ہیں۔ خودی کی پہچان اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ انسان قدرت کی ودیعت کی ہوئی سبھی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتا ہے اور انسانی فطرت چھپے ہوئے فطرت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ "ہر چیز ہے محوِ خودنمائی / ہر ذرہ شہیدِ کبریائی" ہے "بے ذوقِ نمود زندگی موت / تعمیرِ خودی میں ہے خدائی" مگر علامہ اقبال خانقاہی و رہبانیت کے سخت خلاف ہیں۔ تصوف کے دو اعلیٰ و ارفع مقامات کے بھی قائل ہیں جہاں انسان ذاتِ الٰہی کے اوصاف کا حامل بنتے بنتے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے۔ ان کا اکثر سنا ہوا شعر ہے "خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے / خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے" اس کا مطلب یہ کہ قانونِ قدرت میں ہر شے کی تخلیق کا ایک سبب ہے اور وہ سبب اٹل ہے۔ بیج کے بغیر پودا نہ ہوگا۔ سفر کی مسافت طے نہ کی جائے تو منزلِ مقصود نہیں ملے گا۔ نیم کے پتے میں شہد کی مٹھاس نہ ہوگی۔ اسی طرح انسان کی تقدیر بھی معین ہے۔ بدی سے برائی، نیکی سے بھلائی۔ محنت کرو تو پھل پاؤ۔ غفلت شعاری چھوڑ دو گے تو راحت ملے گی۔ انسان کو ایک حد تک اپنی زندگی بنانے کی

طاقت اللہ نے ودیعت کر دی ہے۔ ہمت و محنت، عقل و شعور، علم و حکمت سے وہ اپنی تقدیر بنا سکتا ہے۔ اس کے لیے قدرت کی دی ہوئی مادی و روحانی سبھی طاقتوں کو بطور احسن کام میں لانا ہوگا۔ اسی نازک نکتہ کو شاعرانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں:-

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے، رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے، بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
خودی شیرِ مولا، جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید، آسماں اس کا صید

انہیں فطرت کی ترجمانی کرتے کرتے خودی کے مفہوم کی توضیح کرتے ہیں:-

پہاڑ اپنی خودی چھوڑے تو وہ صحرا کی صورت ہے — جیسے دریا کی موجوں کے تھپیڑوں سے شکست
ہے جب تک موج شکل موج میں دریا کے سینے پر — ابھرتی ہے دوش پر کرکے آب سینے پر
زمیں سے اپنی ہستی میں بہ نسبت چاند کے کم — قمر ہے اس لیے گرد اس کے چکر کاٹتا پیہم

یہاں خودی سے آزادی کی تشریح پورا ہو جاتا ہے۔ محکوم آقا کی مرضی کا غلام ہوتا ہے۔ اس محکومیت سے نجات کا مستعد ارادہ ہو تو کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ زندگی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

جو کر لیتا ہے ایک قطرہ خودی کے نقطے کو ازبر — بنا لیتا ہے اپنی ہستیِ ناچیز کو گوہر

جب خالق نے ایک قطرہ کو موتی بننے کی توفیق عطا کی ہے تو انسان کو جو خلیفۃ الارض ہے اس سے بدرجہا ارفع مقام بخشا ہے جس کا حصول ذاتِ الٰہی کا مدعا ہے۔ اسی طاقت کو خودی کے نام سے تعبیر کرکے تعلیمات درسِ قرآنی دیتے ہیں۔ یہ خودی کی خود فریبی زندگی کا پیام بنتا ہے۔ مشکل کل و شورشوں سے ہو، تب جینا بھی جینا ہے۔

چمن میں پھول کے مانند خودداری میں ہو پختہ — تو خوشبو اپنی پھیلاتے کو گلچیں کا نہ کر چرچا
خودی کا پاسباں ہو کر کبھی غافل نہ دم بھر ہو — نہ بن تو قطرۂ شبنم، جو جینا ہو تو گوہر ہو
فنا چاہے تو آساں ہے خودی سے بے خبر ہو جا — بقا چاہے تو آ، اور خودی میں پختہ تر ہو جا

خودی میں پوشیدہ کمالات کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

۱۔ علامت ہے خودی کی یہ کہ جوہر کو کرے پیدا — ہے اس کی قوتوں کا ذرے ذرے میں پتا ہوتا
۲۔ سمجھتی ہے کہ اپنا ہے سرگرمِ عمل ہو کر — جہاں ہے عامل و مشغول و اسباب و علل ہو کر

یہ اشک ہے اشتیاق ہے چمک کر جاگ اٹھتا ہے   بچھا کر پھونک کر، مار کر مر کر دکھاتی ہے

خودی سے انسان میں خودداری پیدا ہوتی ہے۔ خودداری سے غیرت، غیرت سے ہمت اور ہمت سے محنت۔

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو   عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
خاک میں تجھ کو مقدر نے ملایا ہے اگر   تو عصا افتاد سے پیدا مثال دانہ کر
کسی کے خوانِ نعمت سے نہ تھوڑا سا بھی ریزہ کا   کہیں ہو جائے چشمے سے بھی لیتا ہے کوئی پانی
خدا کی تجلیں اس پہ ہے جو دھوپ میں پیاسا   زمانے کے خضر سے بھی ایک جام پانی کا

خودی کے بعد عمل پر زور ہے۔ خودی کی عمارت عمل کی بنیاد ہی پر کھڑی کی جا سکتی ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ عمل خواب کی تعبیر ہے۔ قدرت ہمیشہ کاوش میں ہے۔ کائنات کا ہر لفظ کچھ نہ کچھ تخلیق ہے۔ کہیں پھول کھل رہے ہیں، کہیں سبزہ اُگ رہا ہے، کہیں تارے چمک رہے ہیں، کہیں موج تڑپ رہی ہے۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے اور ہر شے اپنی فطرت کا تقاضا پوری طرح ادا کر رہی ہے۔ اس معاملے میں صرف انسان سے کوتاہی سرزد ہوتی ہے۔ اگر ہمارا ایمان اس پر ہو کہ یہی مقصودِ فطرت ہے کہ ہر مسلمان نہ اخوت کی جہانگیری و محبت کی فراوانی؟ اگر اخوت و محبت نہ ہو تو مسلمانی کیسی؟ عمل کہاں رہا؟ نام ابوالفضل رکھ دیا اور کبھی مدرسہ کی صورت نہ دیکھی تو کیا خاک علم و فضل کے حقدار بنے؟ دنیا میں سرخروئی اور عاقبت میں نجات صرف عمل کے طفیل ممکن ہے۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب   ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی   ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

علامہ اقبال نے عمل کے ساتھ ساتھ دو اور شرطیں لگائی ہیں۔ یعنی عمل ایسا ہو جس میں ندرت ہو، جدت ہو، کولہو کے بیل کی طرح وہی چکر نہ ہو۔ اس میں نئی بہار، نیا رنگ، نئی خوشبو ہو، اس میں تازگی، ولولہ اور نئی طرز ہو۔ تاریخ اسی وقت بنتی ہے جب ماضی کے برعکس کچھ نیا کھیل کھیلا گیا ہو، یعنی ندرت ہو، جدت ہو، ایجاد ہو، اختراع ہو، انقلاب ہو، دل کو ہلا دینے والی یا توڑنے والی تحریک ہو، تاریخ کی بلندیوں اور پستیوں کا ذکر ہو، تہذیب و تمدن کا عروج یا زوال ہو، معرکہ آرا جنگوں میں ہار جیت ہو، سلطنتوں کے

پیدا ہونے کا سوال ہو، غرض ہر جگہ قدرت کار فرما ہوگی ۔ دوسری شرط یہ لگائی گئی ہے کہ وہ فکر اور عمل ہو۔ انسان کی تمیز فکر سے ہی ہوتی ہے۔ عالم بالا میں خالق کے پاس لفظ "کن" اور کرۂ ارض پر انسان کے پاس فکر یا سوچ یا خیال یا سمجھ سے ہی کائنات کی رونق ہے اگر عمل انسان کا ہاتھ ہے تو قدرت اس کا دل اور فکر اس کا دماغ۔ دل دماغ اور ہاتھ کی ہم آہنگی حرکت سے ہی معجزات زندگی ظہور میں آتے ہیں۔ ایک طرف قدرت سرگرم عمل ہے اور دوسری طرف بشر۔ قدرت کی تخلیق میں جوں جوں اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ہر چیز کمال قابلیت سے بھری پڑی ہے۔ انسان کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو قدرت کی ایسی حیرت انگیز صلاحیتیں ساتھ لاتا ہے کہ اگر اس کی صحیح نشوونما ہو جائے تو وہ اس زمین کا خلیفہ بن جائے گا — لیکن انہی صلاحیتوں کے بے جا استعمال سے شیاطین کی صف میں بھی آ کھڑا ہوگا۔ اسی لیے فکر کی صحیح تعلیم پر علامہ اقبال زور دیتے ہیں۔

"ہر ایک منتظر تیری یلغار کا ۔۔۔ تری شوخیٔ فکر و کردار کا"
ترا کام تو قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے ۔۔۔ جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے"
جہاں تلک بڑھتے رہو چلتے رہنا زندگی ہے ۔۔۔ نہیں گر سوچ میں دم، تو سچ ایک بھولی کہانی ہے
تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول ۔۔۔ لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے ۔۔۔ زمانہ کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے ۔۔۔ سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اقبال جرمن فلسفہ سے صرف اس قدر متاثر ہیں کہ وہ کمزوری کو قبول نہیں فرماتے۔ وہ عیسائی تعلیم کے حق میں نہیں کہ اگر ایک رخسار پر ضرب لگے تو دوسرا رخسار بھی پیش کر دو۔ انھوں نے شاہین کو اپنے طرز خیال کا نمائندہ بنایا ہے جو بلندیوں پر اڑتا ہے۔ اس کو اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے۔ وہ ہمیشہ سرگرم عمل رہتا ہے۔"

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا ۔۔۔ لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب، یہ پچھم، چکوروں کی دنیا ۔۔۔ مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں ۔۔۔ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ۔۔۔ نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

ہر شخص کو اقبال کا یہ شعر ازبر ہونا چاہیئے:—

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے   پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

اقبال کے فلسفے میں تیسرا اہم عنصر تخلیق ہے۔ یہ عمل سے ملتا جلتا ہی ہے۔ عمل وہ ہے جو آدمی کی کوشش سے عمل کا ثبوت ثابت ہو۔ صرف تیئیس سال کے قلیل عرصے میں رسول کریم نے مستقبل کی ساری انسانیت کے لیے ایک حیات کامل کا نقشہ پیش کیا ایک پاک مذہب کی بنیاد ڈالی۔ ایک سچے دین کا عطیہ مرحمت فرمایا۔ ایک بے نظیر نظام سلطنت کی بنا ڈالی۔ ایک تہذیب و تمدن کا اجرا کیا۔ ان کے پیرو ایک صدی سے کم عرصہ میں بحر اوقیانوس سے بحر الکاہل تک پھیل گئے۔ یہ سب کچھ تخلیق کا احساس تھا۔ ایجادات، اختراعات، تحقیق، تفتیش، تعمیر، تعبیر سبھی کچھ تخلیق سے منسلک ہیں۔ صرف ایک شخص ایڈیسن کی ایجادات سیکڑوں تھیں۔ سچا عمل وہ ہے جس سے نئی چیزیں موجود ہوں۔ حالات یا اشیا کے وجود کا احساس وجود (EXISTENCE) ان حالات یا اشیاء کا تجزیہ جوہر طریقہ ہے (ESSENCE) اور اس تغیری حالت کو کمال کی حد تک پہنچانا (EXCELLENCE) یعنی وجود، تغیر اور کمال سے یہ تو ساری مخلوق عمل پیرا ہے ورنہ دنیا نہیں چلتی۔ مگر ایسا عمل انسانی عمل نہیں حیوانی عمل ہے کیوں کہ ہر جاندار شے اپنی زیست کے لیے عمل میں لگی ہے۔ انسانی عمل وہ ہے جہاں تخلیق ہو، ندرت ہو، جدت ہو، تفکر ہو، سود مند ہو، لطافت و شرافت سے بھری ہو۔ سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو کا تخیل بھی تخلیق تھا قرآن، سہ حرف اور سیتا و رامائن کا فلسفہ بھی تخلیق تھا۔ شکسپیر، ملٹن، میر، ذوق، غالب بھی تخلیق میں لگے ہوئے تھے۔ نیٹشے، گوئٹے، ہیگل اور اقبال بھی۔ تخلیق تہذیب کا سرچشمہ ہے قدرت کا قانون ہے۔ مستقبل کا سرمایہ ہے۔ ذات الٰہی کی صفت ہے اور انسانیت کی بقا کا واحد ذریعہ ہے۔ فطرت کی تسخیر خلاق کے مد نظر تخلیق ہے۔ اللہ پاک احسن الخالقین ہے اور اسی صفت کا انعکاس بندوں میں قدرت کا تقاضا ہے۔ جب احسن الخالقین کا ذکر آیا تو اس سے واضح ہو گیا کہ اللہ کے سوا دوسرے خالق بھی ہیں گو کہ ان کا درجہ بہت نیچا ہے۔ کائنات کی ہر شے میں چاہے پھول ہو یا پتی، ستارے ہوں یا چاند، وادیاں ہوں یا جھیلیں، تخلیق کی صورت پائی جاتی ہے۔ ہر چیز میں کبریائی۔ جگنو میں چمک، پھول میں مہک، بلبل میں چہک، مکھی میں شہد، دودھ میں امرت، سورج میں روشنی، چاند میں ٹھنڈک غرض ہر چیز میں خدا کی قدرت ہے۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا ہے اس کی حکمت ہے

لیکن انسان کی تخلیق ایسی تھی ہے کہ دس بیس ہزار سال میں بھی ایک اچھی ریاست کی بنیاد نہ ڈال سکا۔ یہ نا تیوں نے ہر قسم کے تجربے کیے۔ بادشاہت، ملوکیت، اشتراکیت، جمہوریت، طرح طرح کے سیاسی نظام سوچے گئے۔ یہاں تک کہ انھیں اللہ کی ہدایت بھی رہی، پھر بھی اُن کی تخلیق کا یہ ضعف تھا کہ آج تک ایک اچھا نظام نہ بن سکا۔ ایک بڑی سے بڑا ایک کتا ہمیشہ کے لیے وفاداری کا شعار اختیار کر لیتا ہے، لیکن انسان آج جس کے دسترخوان پر روٹی کھائے گا اور کل آپ ہی کا گلا کاٹے گا۔ اس لیے اگر تخلیق میں قدرت کا اتباع کیا جائے تو افضل ہوگا۔ علامہ اقبال کس شان سے للکارتے ہیں۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

افغان کاشتکاروں کو ابھارتے ہیں:۔

"موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز — جس نے اپنا کھیت نہ سینچا، وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان، او غافل افغان

اقبال ذہن نشین کرا دیتے ہیں کہ تخلیق کے امکانات ہمارے سامنے اور کئی ہیں:۔

"جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود"
"افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا"
"مگر پیدا کر اے غافل تجلی عینِ فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا"

شاعر کے دل میں تخلیق کا مادہ کس قدر موجزن تھا اس شعر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی — یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

اقبال کی تعلیمات کا چوتھا عنصر ترقی (PROGRESS) ہے۔ اس کا تعلق بھی براہ تخلیق سے ہی ہے۔ ترقی تخلیق کا ثمر ہے۔ پودے کا پھل پھول ہے۔ انسان کا مقصد حیات ترقی و تمدن ہے۔ تاریخ تمدن و ترقی کو ناپنے کا آلہ ہے۔ چند ہزار سال پہلے انسان اور حیوان میں تمیز نہیں تھی۔ تیس چالیس ہزار سال قبل ہمارے آباؤ اجداد پتوں سے اپنا جسم ڈھکتے تھے۔ جنگل کے پتے اور جڑی بوٹی ان کی غذا تھی۔ آج آدمی چاند پر قدم رکھ چکا ہے اور حیرت انگیز ایجادات سے اپنی زندگی آرام دہ بنا لی ہے۔ فردوس جو تیرا ہے

کسی نے نہیں دیکھا۔ افرنگ کا ہر قریہ فردوس کے مانند ہے۔ ترقی وہ ہے جو اخلاقی قدروں کی زد میں ہو، وہ نہیں کہ تلوار ایجاد کی اور دوسروں کی گردن کاٹی۔ ایک ہٹلر یا ایک ایٹم بم کی وجہ سے لاکھوں کی جان گئی۔ اس کے برعکس ترقی انسانوں کی فلاح و بہبودی کی طرف پیش قدمی ہو تو تہذیب میں اضافہ ہوتا ہے۔ بیماریوں کا علاج تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہی پودے میں کئی نمونے اور رنگ کے پھول کھلائے جا سکتے ہیں۔ کاشتکاری، صنعت و حرفت، تجارت و معاش کے کئی شعبوں میں غضب کی تخلیق سے ترقی ممکن ہے۔ اقبال نطشے کے اس خیال سے تردید کرتے ہیں کہ انسان میں ترقی سے زیادہ تنزل کے آثار ہیں۔ ابھی وہی جنگیں دہشت ناک تباہی کے ساتھ، وہی خود غرضی، فتنہ فساد، لوٹ کھسوٹ، مار دھاڑ غارت گری جو پہلے تھی یا اس سے بھی زیادہ اب بھی ہے؟ علامہ اقبال ہمیں متنبہ کرتے ہیں۔ "گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار؛ طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر" وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں:-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

علم و حکمت سے بے انتہا فوائد کے ساتھ ان کے چند مضر اثرات جو ترقی کی راہ میں مانع ہیں ان کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوز جگر ہے، علم ہے سوز دماغ

انھوں نے موجودہ تہذیب و ترقی کے سطحی معیار کی بھی تکذیب کی ہے:-

میں ان کی محفل عشرت سے کانپ جاتا ہوں — جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں — نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

مغربی طرز ترقی کی بھی مذمت کرتے ہیں:-

"حکم حق ہے لیس للانسان الا ما سعیٰ — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار"

اقبال ترقی کے مغربی نظریہ کو جو (CYCLICAL) کہلاتا ہے یعنی پہیہ کی گردش جیسا، نہیں مانتے۔ اس نظریہ کے مطابق ترقی سطحی ہے۔ انسان کی فطرت نہیں بدلی۔ آج تک جنگوں کا

خاتمہ نہ ہوا۔ نا انصافیوں کا تو مار کم نہ ہوا۔ انسان کی خصلت، ہوس، حرص، ظلم، تشدد، تعصب، حقد، کینہ، جہالت، نفرت، خود غرضی، خود پسندی وغیرہ پہلے سے زیادہ ہی نظر آتی ہے۔ انسان دائرے کے جس نقطے سے نکلا تھا جہاں جہالت تھی اب پھر وہیں آن پہنچا ہے۔ اقبال اس نظریے سے کلی اتفاق نہیں رکھتے۔ وہ (LINEAR) نظریے کے حامی ہیں یعنی زندگی ایک شاہراہ یا خط مستقیم پر رواں دواں ہے، جہالت کے مقام سے نکلی ہے۔ ترقی (PROGRESS) منزل مقصود ہے۔ راستے میں اونچ نیچ کانٹے، اژدہے، بادل بجلی، سبھی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سبزہ زار مناظر بھی ملتے ہیں، بہتے ہوئے ندی نالے، پھل پھول کے باغات، چمن کی روشیں، پرندوں کی چہک، ندیوں کو مہک بھی راستے کے ہمراہی ہیں۔ ترقی اس شاہراہ سے گزرتی ہے۔ انسان باوجود اپنی کمزوریوں کے بہت کچھ سیکھا ہے جسے ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اگر مادی دنیا میں آرام و آسائش کی ہزاروں چیزیں اس نے اختراع کی ہیں تو روحانی سطح پر بھی نیک ہستیوں کے طفیل اس نے بلندی کے کئی مقامات چھوئے ہیں۔ انسان غلطی سے کچھ سیکھتا ہے۔ اور کوشش کرتا ہے کہ وہ غلطی پھر نہ دہرائے۔ اقبال کا کہنا ہے کہ انسان پچھلی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے نئی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی اس کی ترقی کا راز ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ماضی پر ناز ہے۔ اسی پر تکیہ نہ کرنا چاہیے۔ اس کی بنیاد پر نیا عمل تعمیر کرنا ترقی ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کو چودہ صد سال پہلے کے معیار پر جانچنا نہ ہوگا۔ آج کل کے معیار پر، دیگر اقوام کی ترقی کے معیار پر انھیں اپنا محاسبہ کرنا ہوگا کہ وہ کس حد تک ترقی کے ذخیرہ دار ہیں اور موجودہ حیرت انگیز انقلابات میں ان کا کیا حصہ ہے۔

اقبال کے کلام میں پانچواں عنصر قوت کا ہے۔ جسم میں توانائی (ENERGY) نہ ہو تو جسم بیکار ہے۔ قوموں میں قوت یا طاقت نہ ہو تو اوروں کے خدم بن جائیں گے۔ ترقی قوت کے بل بوتے پر ہی ممکن ہے۔ قوت کے بغیر پرندہ پرواز بھی نہیں کر سکتا۔ فطرت کی تسخیر کے لیے قوت چاہیے۔ قوت ذوق عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ صحت کے لیے بھی ورزش ضروری ہے۔ اقبال برگسن کے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں کہ حیوانات میں قدرت نے قوت ودیعت کر دی ہے۔ شیر ہو یا ہاتھی اور سبھی جاندار قدرت کے تقاضے کے مطابق توانائی یا قوت اپنی زیست سے پاتے ہیں، لیکن انسان یہ قوت اپنی عقل سے حاصل کرتا

ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے۔ علم و حکمت مال و دولت سبھی کچھ بعد میں آتے ہیں۔ فوق البشر (SUPERMAN) عقل و شعور سے ہی ظہور میں آتا ہے۔

اقبال کا چھٹا عنصر عشق ہے۔ خودی کے بعد عشق کو ہی انھوں نے اپنے فلسفہ کی جان سمجھا ہے۔ عشق و محبت زیست کا سامان ہیں۔ عشق ہی وجود کا عین سبب ہے۔ عشق سے ہی کائنات ظہور میں آئی۔ عشق خالق کی خصوصیت ہے۔ تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ حسن کا آئینہ ہے۔ زندگی کا سرمایہ ہے۔ انسان کی روح ہے۔ عشق کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ انسانوں میں ہی نہیں حیوانات میں بھی عشق کا جذبہ اس قدر موجزن ہے کہ بھوک و پیاس بھی دوسرے درجہ میں آتے ہیں۔ اقبال کا کہنا ہے: "اگر ہو عشق تو ہے کافری بھی مسلمانی۔ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق" انھوں نے عشق کو بلندیوں کی انتہا تک پہنچایا ہے۔

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم
جہاں میں جیسے مسلم عشق سے بے باک و تابہ ہے
مسلماں گر نہیں عاشق تو وہ زندیق و کافر ہے

اقبال کے تصور کی منزل میں ساتواں زینہ آزادی ہے۔ غلامی موت کے مترادف ہے۔ آزادی کے حصول کے لیے یقین ضروری ہے۔ "غلامی میں نہ کام آتی ہیں نہ شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں"

یقین کے ساتھ ہمت بھی چاہیے

اشارۂ فکر کی ہمت کا قضا کا رخ بدلتا ہے
جو ہوتا ہے وہ اس کے ہاتھ کے سانچے میں ڈھلتا ہے

ہمت غیرت سے پیدا ہوتی ہے۔

پروں کو پھیر پھیر کر تو نکل مٹی کے پنجرے سے
پرندوں کی طرح محفوظ ہو گرنے کے خدشے سے

اگر پرندوں میں اتنی سکت ہے کہ بغیر خوف کے اڑ سکتے ہیں تو انسان کیوں ہمت ہارے؟ آزادی کے لیے اولو العزمی چاہیے:-

جو طوافِ غیری کو موت گردانے وہ زندہ ہے
وجود اپنے کو جو بیت الحرم جانے وہ زندہ ہے

آزادی کے لیے جس کی بہا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ آزادی میں ہی رازِ زندگی مضمر ہے۔

حقیقت مجھ پہ روشن ہے کہ سازِ زندگی کیا ہے ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی کیا ہے
خود اپنے آپ ہی میں صورتِ شمع گہر ہونا اگر کر اپنی خلوت نگاہ سے آتش نفس رہنا
دبی چنگاریوں کو راکھ کی ڈھیری میں بھڑکانا جو نظروں کو جلا دے ایسا شعلہ زار بن جانا

اپنی نظم "پرندے کی فریاد" بچوں کے لیے کس کمال سادگی سے قید کی کہانی قلمبند کرتے ہیں۔

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے، غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

حب الوطنی کے بغیر آزادی دشوار ہے۔ قوم سے مخاطب ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
تعصب چھوڑ ناداں، دہر کے آئینہ خانے ہیں یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اس سرزمین سے انتہائی محبت کر کے کہتے ہیں:-

پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

آٹھواں عنصر خود ارادیت ہے (FREE WILL) قدرت نے اچھے اور برے کی تمیز کے لیے انسان کو عقل کے ساتھ ارادہ بھی عطا کیا ہے۔ یہ نیت کا سوال ہے۔ انسان وہی بنتا ہے جو اس کی آرزو ہے۔ خیالات نیک ہوں، حوصلے بلند ہوں، یقین محکم ہو اور عمل پیہم ہو تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جس فرد یا قوم میں ارادے کی پختگی ہو وہ بھی بہت زور دے گی۔ تو اب باب اخلاقی مقصدِ حیات ہے۔ ارادہ، عمل، تخلیق سب کچھ ایک اعلیٰ نصب العین کے تحت ہو تو انسان کمال کے درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ اخلاقی مقصد وہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے لیے نہیں دوسروں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے۔ دنیا کی ہر شے کسی اور شے کے کام آتی ہے۔ اور خود کے لیے اس کا وجود بیکار ہے۔ پتھر سے مکان بناتے ہیں۔ مکان رہائش کے لیے کام آتا ہے۔ ہوا، پانی، چرند، پرند، درندے تک سبھی کسی نہ کسی طرح اوروں کے کام آتے ہیں۔ پھول کی خوشبو

شہد کی مٹھاس، کتے کی وفاداری، گھوڑے کی تیز رفتاری، بلی کی معصومیت، گدھے کا استقلال سب کچھ دوسروں کے فائدے کے لیے مقصود ہے، اور خود ان کی ذات کے لیے اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں۔ قدرت کا یہ اہم اصول ابھی تک انسان کی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ لکڑی خود جلتی ہے لیکن دوسروں کے لیے کھانا پکاتی ہے۔ وہ سارا کھانا انسان خود کھاتا ہے ایک لقمہ فقیر کو نہیں دیتا۔ اخلاقی مفکر کا مدعا یہ ہے کہ انسان اس قانون قدرت کا لحاظ رکھے اور اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دے۔ قانون قدرت کا اس طرح ملاحظہ آپ ایک کنکر کسی تالاب میں پھینکیے۔ پہلے پانی اچھلے گا، پھر کنکر کے اطراف ایک چھوٹا سا دائرہ بنے گا اور وہ دائرہ وسیع ہوتے ہوتے ساحل تک جا پہنچے گا۔ انسان بھی خاک سے بنا ہوا ایک کنکر ہے جو اپنے گرد ایک دائرہ یا حلقہ بنائے ہوئے ہے۔ پہلا حلقہ تو خود کا ہے۔ یہ حلقہ وسیع ہونا چاہیے۔ خود سے خاندان، خاندان سے گاؤں، محلے، شہر، شہر سے صوبہ صوبہ سے ریاست اور ریاست و ملک سے کل انسانیت تک یہ حلقہ وسیع ہونا چاہیے۔
یہ ہندی وہ افغانی و ایرانی و تورانی ٭ تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
"بنی نوع انسان، اعضائے یک دیگر اند"۔ بچوں کے لیے "ہمدردی" کی ایک چھوٹی سی نظم میں جگنو کی زبان سے مقصد حیات کا یہ پیام دیتے ہیں۔ "ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے" بچے کی دعا میں انھوں نے کائنات کو بھر دیا ہے۔ ——

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب   علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا   درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو   نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

تلاش حق و تعمیر بھی ان کی تعلیمات کا ایک اہم جز ہے۔ حق کی تلاش انسان کا مقصد حیات ہے
"ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے ٭ چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کر دے"
تلاش حق آسان کام نہیں "کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا" کے مصداق اس کے لیے سخت کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لیے تاب حاصل چاہیے۔

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ   کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ
علم و حکمت زاید از نان حلال   عشق و رقت آید از نان حلال

حق کی تلاش میں عقل ساتھ نہیں دیتی:۔

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عقل و دل کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے　　اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام میرا　　عرش ربِ جلیل کا ہوں میں

غرض اقبال کے کلام میں رازِ ہستی کی وہ حقیقتیں مضمر ہیں جو کسی اور کے کلام میں نہیں ہیں۔ علم و حکمت کے وہ موتی دیے گئے ہیں جو تفکر و تدبر کے سمندروں کی تہہ سے نکالے گئے ہیں۔ اُن کا کلام تعلیمات اسلامی کی روح کا نچوڑ ہے۔ عہدِ حاضر کے بلند خیالوں کا مظہر ہے، مشرق و مغرب کے تہذیب و تمدن پر ایک درس تنقید ہے۔ حیات کا پیغام ہے۔ محبت کا پیغام ہے۔ عمل کی دعوت ہے۔ تخلیق کی کنجی ہے۔ ترقی کا تازیانہ ہے۔ آزادی و حریت کا ترجمان ہے۔ مقصدِ حیات کی تلاش کا سرچشمہ ہے۔ حسنِ بیان کا آئینہ ہے خودی کا خزانہ ہے۔ عشق کا سمندر ہے۔ شاعری کی روح ہے۔ احکام الٰہی کا قرآن ہے۔ عشقِ رسول کا گلدستہ ہے۔ ایک محقق نے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام کی روح سمجھنے میں اب تک صرف دو ہستیاں کامیاب رہی ہیں، ایک حضرت عمرؓ اور دوسرے علامہ اقبال۔ اُن کے کلام کو بیسویں صدی کا معجزہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ مسلمانوں کی اخلاقی و علمی رہنمائی میں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے اٹھارویں صدی میں لیا تھا اور سر سید احمد خاں نے انیسویں صدی میں لیا تھا، وہی حضرت علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں لیا۔ اقبال کے کلام میں انقلاب کا جو جذبہ تھا، اسلام کا جو چسکا تھا، جدت کا جو مادہ تھا، حریت کا جو پیغام تھا، اُس سے مسلمانانِ ہند کی سیاست میں ایک تہلکہ مچ گیا اور اس برصغیر کی تقدیر میں ایسی پلٹی کہ جس کا وہم و گمان پہلے کبھی نہیں تھا۔ تخلیق کے پیغمبر نے سیاست کا وہ بیج بویا جو چند ہی سال میں ایک تناور درخت بن گیا۔

مولانا آزاد کی قیادت

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے ملک کی اُن ممتاز ہستیوں میں سے ہیں جن کے وقار، تمکنت، علم و ادب میں بلندی، سیاست میں فراست، دینی و دنیوی امور میں تبحر، دور اندیشی اور وفاداری میں سبقت کی وجہ سے ان کا نام صفحۂ تاریخ پر وہ درخشاں ستارے کی طرح چمکتا رہے گا۔ ملت اسلامیہ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اس کی سسکتی ہوئی حالت پر قدرت کو رحم آگیا اور ویسے طبیب یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے کہ جن کی تشخیص و علاج سے روح تحلیل ہوتے ہوتے بچ گئی۔ سرسید اور اُن کے رفقائے کار نے مریض کی بڑی خدمت کی۔ حالی نے شفقت کا وہ ہاتھ پھیر کر دل کو تسکین ہو گئی۔ علامہ اقبال نے سکڑے ہوئے ذہنوں اور ٹھٹھرے ہوئے سینوں میں وہ ہوا بھر دی کہ نئی سانس آنے لگی۔ اور اب جو مولانا آزاد بستر کے قریب آئے تو مریض کے لیے مغربی نشتر کے بجائے مشرقی معجون کی راے دی۔ طبی علاج ہی کو انھوں نے پسند فرمایا۔ لیکن مریض کے اہل خانہ اس تجویز کو نہ مانے اور نشتر کی ہی جیت ہوئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ مریض کا ایک ہاتھ کٹ جانے سے وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو چکا ہے۔ کسی نے کہا کہ بیماری کا یہی ٹھیک علاج تھا۔ مگر بہتوں کو اس بات سے اتفاق نہ تھا۔ مگر نشتر کے چلنے سے مریض کے دل و دماغ پر جو حالت گزری اور جو قیامت صغریٰ برپا ہوئی اس کا صحیح اندازہ صرف اُس حکیم ملت کو تھا۔ جو مولانا آزاد کہلاتا ہے۔

مولانا آزاد اسلامی تعلیمات کے ماہر تھے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، فلسفہ اور مشرقی علوم پر انھیں کافی عبور رہا۔ ان کے دماغ میں برق تجلی تھی۔ فہم و ذکا ایسا تیز تھا کہ فلک تک رسائی روشنی کی رفتار سے طے پاتی۔ جمالیات کا ایسا ذوق تھا کہ کائنات کی

خوبصورتی ان کے تصور میں مقید تھی۔ کلام میں ایسا جادو تھا کہ سننے والوں پر رقت طاری ہو جاتی۔ قلم میں وہ قوت تھی کہ شہنشاہیت کے حواس اُڑ جاتے تھے۔ صحافت میں وہ اقتدار تھا کہ حکومت کا دل دہل جاتا تھا سیاست میں وہ شان تھی کہ سب حریف ان کا لوہا مانتے تھے۔ شرافت کا وہ عالم تھا کہ طبیعت میں شبنم کی پاکیزگی تھی۔ نفاست کی دلکشی وہ تھی کہ پھول کی پنکھڑی شرما جاتی۔ ولولہ، شوق و جذبہ ایسا تھا کہ دریا کے تند و تیز کی طرح ہر رکاوٹ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ غرض وہ ایک عجیب شخصیت تھی جس نے اس ملک کے سفینے کی ملاحی اُس وقت قبول فرمائی جب کہ طوفان کے تھپیڑوں سے ساحل کا نشان ناپید تھا۔

مولانا آزاد کی قیادت کے دو پہلو تھے۔ ایک حریت کے میدان میں قوم کی رہبری اور دوسری تہذیب و تمدن میں مذہبی رہنمائی۔ سیاست میں یہ علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے جو غیر ملکی اقتدار سے تعاون پر مبنی تھی۔ سرسید نے مصلحتاً مسلمانوں کو سیاست کی پیچیدگیوں سے کچھ عرصہ تک الگ رہ کر اپنی تعلیمی تہذیبی سماجی و اقتصادی حالت بہتر بنا لینے کی ہدایت کی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مسلمان سیاست کو بھول جائیں بلکہ یہی کہ قوم مقدم باتوں پر پہلے توجہ دے اور جب وہ ٹھیک ہو جائیں تو بقیہ اقدامات آسان ہو جائیں گے۔ سرسید کے نزدیک قوم کی زندگی اہم تھی اور سیاست بعد میں آتی تھی۔ زندگی تعلیم سے، تہذیب سے اور اخلاق سے تعبیر تھی۔ اور وہ اس کے سدھار میں لگے تھے۔ مریض کی یہ بیماریاں دور ہو جائیں تو دوسری شکایتوں پر نظر ڈالی جائیں گی۔ قوم کے حق میں یہ تشخیص ٹھیک تھی مگر ان شکایتوں کا جب ازالہ ہوا تو دوسرے امراض کی طرف توجہ مبذول ہی نہ ہوئی۔ وہی ایک علاج باقی رہا جو سرسید نے بتایا تھا۔ اس علاج کے نسخوں سے غیر ملکی اقتدار کو بہت فائدہ تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس کوشش میں لگا رہا کہ مرض کا علاج کسی اور طریقہ سے نہ ہو۔ یہ علاج مریض کو بھی عارضی تسکین بخشتا ہی تھا گو کہ اس کی روح اندر سے کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی۔ ایسے وقت پر مولانا آزاد منظر عام پر آئے اور ہوا کا رخ بدلنا چاہا۔

سرسید کی رحلت کے بعد علی گڑھ تحریک کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو کالج کے یوروپی اسٹاف کے زیر اثر آ چکے تھے اب تعلیم، سیاست سے مدغم ہو رہی

تھی ملک کی دیگر اقوام حریت کے لئے میں پیچھے رہ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ مسلمان مکمل
آزادی کی اس جنگ میں ان کے شریک رہ کر فرنگی استبداد کا جبر تاتار کر دیں۔ انگریز جو
سیاسی شطرنج کے ماہر تھے مسلمانوں کو وہ مہرہ بنانا چاہتے تھے جس سے کانگریس
کی چال مات ہو سکے۔ کانگریس ہندوؤں کی ہے تو مسلم لیگ مسلمانوں کی ہو۔ انگریزوں نے
کانگریس کا کھلونا ہندوؤں کے ہاتھ میں تھمایا تو تھا اس بہانے سے مسلم لیگ کا کھلونا
مسلمانوں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اگر ہندوؤں میں قومیت کی وجہ سے اتفاق پیدا ہوا تو
مسلمانوں میں مذہب کی وجہ سے اتفاق ہو۔ اگر ہندوؤں کو جمہوریت کے نشے سے تاب رکھا
ہو تو مسلمانوں کو اپنی تہذیب کے نشے سے سرشار کر دو۔ اگر ہندو تشدد پر اتر آئیں تو
دیکھیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان سہم جائیں اور کسی کی ہمت نہ ہو کہ انگریز کا مقابلہ کریں۔
غرض ملک کا سیاسی نقشہ عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

ایسی صورت حال میں مولانا آزاد کا دھماکے سے سیاست میں کود پڑنا انگریزوں کی
چال کی زبردست شکست تھی۔ برصغیر میں مسلمان ایسے پھیلے ہوئے تھے کہ وہ ہر جگہ موجود
تھے لیکن کہیں اقلیت اور کہیں اکثریت میں۔ اکثریت شمالی مغربی صوبوں اور مشرقی صوبے
بنگال و آسام کے حصوں میں تھی۔ بقیہ سبھی جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ مولانا آزاد اکثریت
کے صوبہ بنگال سے للکارا کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہندو و مسلم کے تفرقے عارضی ہیں۔
ملک کی وحدانیت مسلم ہے۔ غیر ملکی حکمران کسی کے کام نہ آئے گی۔ ملک سے وفاداری
اسلام کا پیغام ہے۔ آزادی کا ایک دن غلامی کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ آزادی
زیست کا سامان ہے۔ حریت ہر قوم کا حق ہے۔ اتحاد و اتفاق میں تقویت ہے۔
مسلمان محب وطن ہے۔ اس کا ایثار و قربانی بے مثال ہے۔ انگریزوں کے خلاف
کسی نے اتنی جنگیں نہیں لڑیں، کسی نے اتنی جانیں نہیں دیں، کسی نے اتنی صعوبتیں
نہیں سہیں، جتنی کہ مسلمانوں نے۔ گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑی تو سب سے
پہلے ہماری ہی گردن کٹی۔" غرض مولانا آزاد نے ہوا کا رخ بدلنا چاہا اور مسلمانوں
کو پھر اسی مرکز پر لانے کی کوشش کی جہاں وہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے تھے۔

مولانا آزاد کا حربہ ان کی صحافت تھی۔ الہلال و البلاغ کے پرچے ہماری
جنگ آزادی کے وہ سنہری ابواب ہیں جن سے حریت کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

اُن میں بلا کا جوش بھرا پڑا ہے۔ ان میں مسلمانوں کے تخیل کی بلندیاں نظر آتی ہیں۔ ان میں اسلام کی عظمت جھلکتی ہے۔ ان میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ان میں قومی اتحاد کی دعوت ہے۔ ان میں مسلمانوں کے مسائل کا حل موجود ہے۔ ان کی سماجی، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی تنظیم کے نکتے بیان ہوئے ہیں اور ان کی بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ ان کا مقصد ملک کی سبھی قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہے۔ سبھوں میں آزادی و حریت کا ذوق بھرنا ہے اور ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کی اکثر جماعت نے سرسید کی چلائی ہوئی علی گڑھ کی تحریک پر لبیک کہا تھا تو آزاد نے اس کے خلاف کیوں آواز اٹھائی؟ کچھ مسلمان اس بات سے خوش تھے کہ دہشت کا دور ختم ہو چکا تھا ہر طرف امن کا دور دورہ تھا۔ مسلمان پڑھ لکھ کر کمشنر، کلکٹر بن رہے تھے۔ مغربی علوم نے چند مسلمانوں کو بھی اس تہذیب و تمدن درجہ تک پہنچا دیا تھا۔ کونسل، صدارت، ممبری بھی ان کے لیے ڈال دی تھی۔ انگریز مہربان تھے۔ مراعات کا سلسلہ جاری تھا۔ تعلیمی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ وہ تڑپ کی حالت جو غدر کے زمانے میں تھی جاتی رہی۔ اور اب جب کہ مغرب کے نشے سے کچھ سرور مل رہا تھا تو پھر یہ ہنگامہ کیوں؟ اس لیے البلاغ والہلال اور آزاد کی ساری تحریریں اقبال کے اُس خیال کی تائید میں ملتی ہیں کہ "اے طائر لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی ہے جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" مولانا آزاد بھی علامہ اقبال سے اتفاق کرتے تھے کہ مغرب کا انداز فکر ہندوستانیوں کے حق میں مفید نہیں۔ "گرچہ دلکشا بہت افرنگ کی بہار، اے طائر بلند بال، دانہ و دام سے گزر"۔ مولانا آزاد مغرب کی سیاسی روح کو پہچان گئے تھے۔ مغرب کا پیغام جبر ہے، اقتدار ہے، استبداد ہے، قوت ہے، طاقت ہے۔ یہ کبھی توپ کی نلی سے حاصل کی جاتی ہے اور کبھی حکمت عملی سے۔ توپ کی نلی آخر میں آتی ہے جب کہ حکمت عملی کے سارے نسخے خالی جاتے ہیں۔ ہندوستان میں حکمت عملی یہ تھی کہ دو فرقوں کو لڑاؤ اور اپنا مطلب نکالو۔ پلاسی کی جنگ سے یہ ڈرامہ چلا آ رہا تھا۔ کبھی اس نواب کو اس نواب سے لڑاؤ، اس راجہ کو اس راجہ سے لڑاؤ۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ نواب اور راجہ کو ملنے نہ دو۔ یہ طریقہ کی پالیسی بھی نہ

اختیار کرو۔ کبھی اتنا مارو کہ سسکتے رہ جائیں اور کبھی استارِ حرم پر لوٹ کر لوگ مطیع ہو جائیں۔ گولہ بارود ہمیشہ گرم رکھو مگر مرہم پٹی کے لیے اسپتال بھی کھولو۔ مزدور کا خون چوسو مگر سرمایہ دار سے کلب میں دوستی بڑھاؤ۔ تھوڑوں کو مغرب کی تجارت و صنعت کے گریجویٹ کرو وہ بہتوں سے بے جا فائدہ اٹھائیں۔ کالجوں میں آزادی کا سبق دو دفتر میں ہندوستانی کو غلام بنا کے رکھو۔ بے ضرورت آرائش کا چسکا عوام میں بٹھا دو تاکہ یورپ کا مال بکے۔ یہاں کا مال سستا خریدو اور اپنا مال مہنگا بیچو۔ فوج میں بھرتی سوچ سمجھ کر کرو تاکہ وہاں بھی فوائد کا توازن برابر رہے۔ سرکاری نوکریوں کا وقار آسمان تک چڑھاؤ تاکہ پڑھا لکھا طبقہ اس میں کھپ جائے اور غیر مزدوری حریت کا جذبہ ان میں نہ ابھرے۔ ملک میں تفرقوں کی بنیادیں بڑھاؤ۔ کہیں زمینداروں کا حلقہ، کہیں اقلیت کا حلقہ، کہیں اچھوتوں کا حلقہ، کہیں مسلمانوں کا حلقہ، کہیں تاجروں کا، کہیں دستکاروں کا، کہیں سرمایہ داروں کا اور ان میں ایسی کٹ بندی بڑھاؤ کہ ہر ایک دوسرے کا حریف ہو۔ غرض سامراجِ مغرب کے نہ جانے کتنے پھندے دیکھنے میں ایسے خوشنما تھے جیسے کاغذی پھول۔ پھندے ہیں کہ ہندوستانی کی جان پر بھڑکتے تھے مگر یہ حقیقت تھی انسان نوعِ انسانی کا شکاری بن گیا تھا۔ مولانا آزاد نے مغربی چال کی پول کھول کر رکھ دی۔ یہی "الہلال" و "البلاغ" کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔

مولانا آزاد سلطان شہید کی اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ ایک مسلمان پکا مسلمان ہونے کے باوجود سچا محبِ وطن بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام اور قومیت میں تضاد نہیں ہے مذہب اسلام بھی انسانیت کا وہی سبق دیتا ہے جو سبھی سچے مذہبوں کا تقاضہ ہے اس ملک میں ہندو مسلمان صدیوں ساتھ ساتھ رہے تھے۔ مشترکہ تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی۔ رہن سہن، عادت و اطوار، طور طریقہ، رسم رواج، میل جول، دکھ سکھ، خوشی غمی غرض زندگی کے ہر شعبے میں دونوں برابر کے شریک رہے تھے۔ غیر ملکی اقتدار، پرائی تہذیب، اجنبی اصول، تفرقی تدبیریں، اور خود غرضانہ احساسات سبھی کچھ یورپ سے درآمد کیا ہوا مال ہے۔ اس کی ابھی ضرورت نہیں۔ ان کو نکال پھینکنے میں ہی ملک کی بھلائی ہے۔ یہ مولانا آزاد کا خیال تھا اور وہ آخر تک اسی مہم میں لگے تھے کہ کسی طرح نفاق کا زہر دلوں سے نکلے۔ ملک کا بٹوارہ نہ ہو۔ ہندو مسلم مل جل کر رہیں۔ ایک

اچھی ریاست کی بنیاد ڈالیں۔

جس طرح سلطان شہید اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے اسی طرح مولانا آزاد بھی ملک کی وحدانیت برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ جس طرح ناکامیوں کے باوجود سلطان کے سر حکمت ۲۲ پر رکھا گیا، اسی طرح مولانا آزاد کا وقار آزادی کے بعد کئی گنا زیادہ ہو گیا۔ حق کی تلخی زہر لگتی ہے۔ وہی مسلمان جو آزادی سے قبل انہیں کانگریس کا مہرہ سمجھتے تھے بعد میں پرستش کرنے لگے۔ ان کی دور اندیشی کی داد دینے لگے۔ ان کی تائید کے خواہاں ہوئے اور ان کی قیادت کو تسلیم کرنے لگے۔ مگر پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ ملک کٹ گیا تھا۔ انسانیت بٹ گئی تھی۔ اور معیشت سپرد تلاطم ہو چکی تھی۔ مولانا آزاد نے قوم کی غلطیوں کا کافی کفارہ نقصانات سے ادا کیا۔ کم از کم انہوں نے دیگر چند غیر مخلص مسلمانوں کی طرح ملک کی وحدانیت کے لیے جان تو سہی دھن قربان نہ کیا ہوتا تو سارے بھارت کی مسلم اقلیت کا حشر جو ہوتا وہ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد کی سیاسی رہنمائی بہتوں کو آب حیات کے مصداق مفید ثابت ہوئی۔

مولانا آزاد کا دوسرا کارنامہ مذہبی رہنمائی ہے۔ ان کی پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی۔ ان کی تعلیم شام، عراق اور حجاز میں ہوئی۔ ان کا سارا ابتدائی ماحول خالص اسلامی تھا۔ ان کا سارا علمی ذخیرہ علوم مشرق سے ہی بھرا تھا۔ مذہبی تعلیم خاندانی ورثہ میں مل گئی تھی۔ نوجوانی تک ان کے ذہن پر مغرب کی پرچھائیں بھی نہ پڑی تھی۔ اسلامی تہذیب کا ستھرا باب ان کے دل و دماغ پر نقش تھا۔ فقہ، حدیث، تصوف اور تفسیر سے گہری واقفیت اور خود اپنے دماغ کی تخلیقی قوت اور تخیل کی پرواز سے اسلامی علوم کا وہ سرچشمہ ان کے ذہن میں موجزن تھا جو انہیں بیسویں صدی کے صف اول کے عالم دین کہلانے کا شرف بخشتا تھا۔ ایسے جید عالم، خطیب، ادیب، مفسر، محقق و مفکر تھے کہ ان کی ذات سے کئی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات سرانجام پائیں۔ جہاں سیاست میں ناکامی ہوئی اس کا کافی تدارک تہذیبی امور میں نظر آتا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے اجتہادی نظریہ اجماع کی تائید نہیں کرتے۔ مولانا آزاد کا نظریہ تأسیس ہے یعنی قرآن آیات کی تخیلی تشریح ٹھیک نہیں بلکہ اسلام میں جو بنیادی حقائق ہیں ان پر عقیدہ ضروری ہے۔ اس میں مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس میدان میں قرون وسطیٰ ہی میں کافی بحث چلی ہے اور کو

عقیدے جنہ ایمان پر عمل درآمد کافی ہے۔ اس لحاظ سے مولانا تقلیدی گروہ حامی تھے۔ اس پہلو کی روشنی میں مذاہب اسلامی کی جانچ پڑتال بالکل کمال لگانے کے مطابق ہوگی جس سے اسلامی عقیدوں کا بھی وہی حال ہوگا جو مارٹن لوتھر کے بعد عیسائی عقیدوں کا ہوا۔ مولانا آزاد کے سامنے سرسید کی مثال تھی جو مذہب کی کنہ نفس کو عقل کے آئینہ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ چونکہ عقل عیار ہے اور سو بھیس بدل لیتی ہے مذہب ہی فساد سے میں رہے گا۔ اس لیے مولانا آزاد کا پہلا اصول تھا کہ عقل کو مذہب میں دخل نہ ہو۔ مذہب دل کی بات ہے اور دل سے ہی عشق کا وہ مقام ابھرتا ہے جو قرب الٰہی ہے۔

مولانا آزاد کا دوسرا اصول یہ تھا کہ بندہ اور خالق کا رشتہ ذات الٰہی کی اُن تین صفتوں میں منحصر ہے جو ربوبیت، رحم اور عدل کہلاتی ہیں۔ ربوبیت خالق کی وہ صفت ہے جس سے تخلیق عمل میں آتی ہے، ہر شے نشو و نما پاتی ہے اور قدرت کا منشا پورا کرتی ہے۔ رحم وہ صفت ہے جو تخلیق کی جڑ ہے۔ عشق سے کائنات ظہور میں آئی۔ عشق و محبت، رحم و کرم ہی خود زندگی کا سرچشمہ ہے۔ عشق و محبت نہ ہو تو نہ وجود ہوگا نہ نمود نہ پرورش اور نہ نشو و نما۔ رب العالمین کی یاد رحم و کرم کی طرح سے ہی کی جاتی ہے۔ رحم و کرم ہی ہر شے میں ملاپ کا ذریعہ ہے، زیست کا حاصل ہے اور قربت کا تقاضہ ہے۔ عدل ذات الٰہی کی تیسری صفت ہے جو کائنات میں توازن برقرار رکھتی ہے۔ عدل و انصاف نہ ہو تو سارا انتظام درہم برہم ہوگا۔ شر ہر طرف جڑ پکڑ جائے گی۔ معصوم کٹ جائیں گے اور ظالم راج کریں گے۔ عدل و انصاف اس لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنے حقوق و حدود کو پہچانے۔ نیکی و بھلائی سے فائدہ کی توقع تحقیق بلا وجہ یا دیگرانی سے ممکن ایلید۔ سرسید کے نزدیک تخلیق آئین فطرت کے مطابق ہوتی ہے لیکن مولانا آزاد کے پاس ربوبیت تخلیق کا اصل سبب ہے۔

مولانا آزاد کا تیسرا اصول جمالیات ہے یعنی حسن۔ یہاں یہ بو علی سینا کے فلسفے سے متفق ہیں کہ حسن آئینہ حق ہے اور دل آئینہ حسن۔ ذات الٰہی کا کائنات کا وہ لازوال جمال و جلال ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ کل کائنات اسی حسن کا پرتو ہے۔ یہ خود خالق کی ایک شان ہے۔ اس شان کا سبب عشق ہے۔ عشق حسن کا پرستار ہے اور حسن کائنات کے اظہار کا کمال ہے۔ خوبصورتی وہاں پائی جاتی ہے جہاں ہر شے

کمال کے توازن میں برقرار ہے، جہاں خدا کی دشمنی نہیں، افراتفری نہیں، ہر شئے میں معقولیت، مناسبت، مطابقت۔ یہ قدرت کا کھیل ہے کہ وہاں کوئی چیز نکمی نہیں، کوئی چیز بری نہیں۔ چھوٹے میں بھی شان، بڑے میں بھی شان ہے۔ قدرت کا منشا ہے کہ یہ حسن، یہ خوبصورتی، یہ کمال، یہ جمال اور یہ شان انسانوں کے کردار میں بھی آئے یہی مذہب کا راستہ ہے، فطرت کا آئین ہے اور ارشاد ربانی بھی۔ مولانا آزاد کے فلسفہ میں جمالیات کا بڑا دخل ہے۔ وہی ان کی تحریروں کی جان ہے اور ان کے تخیل کی معراج ہے۔

مولانا آزاد کا چوتھا اصول عشق ہے جو بندہ کو خالق سے ملاتا ہے۔ قرب الٰہی کا واحد ذریعہ ہے۔ ذات الٰہی سے محبت رکھتے رکھتے بندے بندے میں رشتہ جوڑتا ہے۔ حسن و عشق کی زنجیر ہی سارے مذاہب کو ایک مالے میں پروتی ہے اور ساری خلقت کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑی کرتی ہے۔ انسانیت کا پیغام دیتی ہے۔ اسلام کے بنیادی حقائق پر پکا عقیدہ رکھتے ہوئے بھی مولانا آزاد کا دیگر مذاہب کے تئیں رویہ بڑا رواداری کا تھا اس لیے کہ ان کی نظر فروعات و خرافات سے ہٹ کر ہر مذہب کے اصلی جوہر پر تھی۔ ہر مذہب میں اچھائی ہے اگر اس کا بے تعصبی سے اعتراف کر لیا جائے تو آپسی کشمکش کے کئی تنازعات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ سیاسی میدان میں مولانا آزاد دیگر مذاہب والوں کے ساتھ اس قدر قریب آ گئے تھے انسان میں اگر فکر صحیح موجود ہو تو امت کی سبھی مشکلات دور ہو جائیں۔

سرسید ارتقاء (EVOLUTION) پر عقیدہ رکھتے تھے کہ کائنات ہر شئے کا وجود ایک دوسرے سے منسلک ہے اور ہر شئے بتدریج ظہور میں آتی ہے لیکن مولانا آزاد اس پر یقین نہ کرتے تھے بلکہ آنا فانا تخلیق یا (DEVOLUTION) بحران کا ایمان ہے۔ یعنی اسلام میں قوت الٰہیہ منشا اور ارادے سے ہر چیز وجود میں آتی۔ رب العزت کے "کن" سے تخلیق وابستہ ہے۔ مولانا آزاد شریعت کے قانون میں تبدیلی کے بھی خلاف تھے۔ وہ نہیں مانتے تھے کہ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے یہاں وہ متقدمین کے نظریے سے متفق تھے کہ قانون قدرت اٹل ہے۔ وہ علامہ اقبال کے اس نظریہ سے کہ خودی سے تقدیر بھی بدلی جا سکتی ہے، اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اقبال نے

انسان کو کائنات کا مرکز بنائے رکھا تھا جو اپنی تقدیر کا فیصلہ خود بھی کر سکتا ہے۔ مگر آزاد کے نزدیک انسان کی حدود میں پھنسا ہوا تھا اور اس کی حق ارادیت صرف اس حد تک محدود ہے کہ وہ ایک اخلاقی شخصیت کی تلاش میں نیکی کی طرف مائل ہو۔ قدامت پرست ہونے کے باوجود مولانا آزاد انسانیت کے بڑے علمبردار تھے۔ وہ مذہب کے ناطے انسانوں میں ذات برادری کے حقوق پھیلانے کے حق میں نہیں تھے بلکہ انسانیت کے ناتے ساری خلقت کو آپس میں بھائی بھائی دیکھنے کے حق میں تھے۔ وہ حالی کے خیال کے حامی تھے "یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا: کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا"! مولانا آزاد کا مسلک اسلامی بھائی چارہ اصول کو کسی مذہب رنگ، روپ، نسل کی تفریق کے بغیر ساری انسانیت کے لیے عام کر دیتا تھا۔

غرض مولانا آزاد کا شمار ہماری عظیم المرتبت ہستیوں کے صف اول میں آتا ہے۔ ان کی صحبت علم کا سرچشمہ ہوتی تھی، ان کی مجلس سیاست کا ایوان ہوتی تھی۔ ان کا کلام اخلاق کا دیوان ہوتا تھا۔ ان کا قلم حریت و آزادی، مذہب و ملت، اتحاد و اتفاق، انسانیت و ہمدردی کے موتی رولتا تھا۔ ان کا سینہ علوم مشرقیہ، قرآن و حدیث، فقہ و فلسفہ سے منور تھا۔ ان کا دماغ دیش کی آزادی کے لیے بے تاب تھا۔ ملک کی وحدت کے وہ پرستار تھے۔ سامراجی مغرب کے وہ سخت حریف تھے۔ اسلامی شان کے علمبردار تھے۔ جمالیات کے دلدادہ تھے، اخلاقیات کے ماہر تھے۔ پاکیزگی و نفاست، متانت و سنجیدگی، وقار و تمکنت، طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ علم کی فراوانی کا وہ عالم تھا کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر تین صد صفحات سے تجاوز کر گئی۔ سیاست میں وہ فراست تھی کہ کس کی مجال ان کی تجاویز کو رد کرے۔ خطابت میں وہ جادو بیانی، فکر کی بلندی تخیل کی پرواز اور معلومات کا ذخیرہ کہ مجمع بے قابو ہو جائے۔

خصلت میں شاہانہ ڈھنگ اور امیرانہ امتیاز تھا، فطرت میں سیماب کا رنگ اور طبیعت میں حمیت و غیرت کا طوفان موجزن تھا۔ حق و انصاف، راست بازی و ایمانداری، بے تعصبی و رواداری کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ غرض مولانا آزاد قدرت کی طرف سے موجودہ صدی میں عہد ماضی کے ایک معزز سفیر بن کر آئے تھے جنھوں نے پچھلی قدروں کو ابھارنے میں کمال کی قابلیت کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمات

تعلیم کے ماہر، قوم کے رہبر، اخلاق کے پیکر، اور انسانیت کے علمبردار ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے ملک کی اُن مایہ ناز ہستیوں میں سے تھے جن کے احسانات سے قوم کا سر ادب و احترام سے جھکا جاتا ہے۔ اس دیش میں صد، دو ایسے چند ہوں گے جن کے کارناموں کی تجلی قوم کے دلوں کو ہمیشہ منور کرتی رہے گی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ قوم و ملت کے لیے ان کی ایک ایسی یادگار ہے جس سے علم کا سرچشمہ ہمیشہ پھوٹتا رہے گا۔ ذہن کی تاریکیاں دور ہوتی رہیں گی۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہے گا، تحقیق و تفتیش کا شوق ابھرتا رہے گا اور انسانیت کا سبق ملتا رہے گا۔ اس کو بنانے اور پروان چڑھانے میں انھیں جرأت مومنی کی ضرورت پڑی اور صبر ایوب درکار ہوا۔ حالات ایسے ناساز گار تھے کہ وجودِ جامعہ کو معجزہ سے کم نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ ذاکر صاحب نے اپنے ذمہ ایسا اہم اور ایسا کٹھن کام لے لیا تھا کہ جس سے قوموں کی زندگی بنتی ہے۔ تعلیم کے قلم سے ہی قوموں کی قسمت کا فیصلہ لکھا جاتا ہے۔ اس دیش کے کروڑوں انسانوں کو علم کے زیور سے مزین کرنے کی تجویز، ان کی شخصیت بہتر بنانے کا منصوبہ، ان میں تخلیقی قوت پیدا کرنے کی کوشش، ان میں اخلاقی قدروں کو ابھارنے کا ارادہ، اور ان میں تہذیبی، تمدنی، اور انسانی شعور اُجاگر کرنے کی سعی، کچھ آسان کام نہ تھا۔ قدرت کا یہ احسان ہے کہ جب ملت اسلامیہ تاریکیوں کے غار میں پھنس چکی تھی تو ذاکر صاحب جیسا رہبر اعظم اُسے عطا کیا جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر قوم و ملت کو روشنی کے

دیا نے للکرا لیا

یہاں یہ بات کہہ دینی ضروری ہے کہ ذاکر صاحب کا کارنامہ صرف ایک دارالعلوم کو حقیقت کا مظہر بنا کے چھوڑ نا ہی نہیں تھا بلکہ ہندوستانیوں کو اخلاقی شخصیت کی ان بلندیوں پر لے جانا مقصود تھا جہاں سے انسانیت کی کلماری شروع ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ ملت کی دوسری واحد مایہ ناز درسگاہ ہے جو مسلمانان ہند کی علمی و ادبی زندگی کی نشاندہی کرتی ہے اور آج ایک مرکزی یونیورسٹی کی حیثیت سے ملک کے مایہ ناز تعلیموں میں شمار کی جاتی ہے۔ مگر ہمارے دیش میں ایک سو تو اسی دیگر یونیورسٹیاں بھی موجود ہیں۔ ذاکر صاحب کی عظمت اس نقطۂ نگاہ سے جانچی نہیں جاتی کہ ان کا کارنامہ صرف علم کے چراغ کو روشن کرنا تھا۔ علم معلومات کا خزانہ ہے اور صرف اس کو پانے سے آدمی انسان نہیں بنتا۔ قارون کے پاس بھی خزانہ تھا مگر اس کی عزت کہیں نہیں۔ علم کے خزانے کا صحیح استعمال تعلیم ہے۔ علم الگ شے ہے، تعلیم الگ شے ہے۔ ذاکر صاحب کی عظمت تعلیم کے میدان میں ہے۔ تعلیم سے کئی بھری دولت تربیت ہے۔ ہندوستان کے ہزاروں مکتبوں، مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا، لکھایا جاتا تھا، تعلیم و تربیت نہیں ہوتی تھی تعلیم کے مفہوم ہی کو نہیں سمجھا گیا تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ پہاڑ کھود کر معدنیات، سونا چاندی نکال جا رہا تھا لیکن ان کو زیور بنانے کا ہنر معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے کئی اور مدارج درکار ہیں۔ سونے کو آگ میں تپانا ہوگا، اس میں ملی ہوئی کثافتوں کو دور کرنا ہوگا، جس نوع کا زیور مقصود ہو اس کا تصور ذہن میں بٹھانا ہوگا اور یکے بعد دیگرے مختلف مدارج کے کاموں کو پورا کرنا ہوگا۔ اسی طرح تعلیم کا کام درس و تدریس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی مثال ایسی بھی ہوتی ہے کہ گائے اور بھینس گھاس چرتی ہے اور کل سفید دودھ دیتی ہے ان دو صورتوں میں قلب کی تبدیلی پائی جاتی ہے۔ انسان اسے غذا کھاتا ہے اور کل اس کے دماغ سے اختراعی چیزیں نکلتی ہیں یہاں بھی قلب کی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔ سبز گھاس کا گائے کو یا روٹی کا انسان کو فراہم کرنا علم یا معلومات میں شامل ہے۔ لیکن ان کی تبدیلی، دودھ یا ذہن کی فراست کی صورت میں تعلیم سے تعلق رکھتی

ہے۔

یہ نکتہ افلاطون نے بتایا تھا۔ ذاکر صاحب کی فراست کا یہ عالم تھا کہ علی گڑھ کے طالب علمی کے زمانے میں ہی افلاطون کی کتاب "جمہوریت" (PLATO'S REPUBLIC) کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا تھا۔ ان کی تعلیم میں دلچسپی اس وقت سے شروع ہوئی۔ گویا اس میدان میں انھوں نے افلاطون سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ افلاطون کا کہنا ہے کہ تعلیم وہ روشنی ہے جس سے انسانوں کے دل و دماغ منور ہو جاتے ہیں۔ صرف روشنی کی موجودگی علم ہے مگر جب تک دل و دماغ کی تاریکی دور نہیں ہوتی انسان تعلیم یافتہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ تعلیم مقصد حیات ہے تربیت شاہراہ ہے اور علم مسافت کا آلہ ہے۔ آپ کے پاس موٹر گاڑی موجود ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ اس کے لیے مسافت بھی طے کرنی ہوگی۔ روشنی علم کا تعلیم و تربیت سے ہے۔ صرف کسی چیز کی موجودگی سے افادیت نہیں۔ اس کی اصلیت کا جوہر نکالنا ہوگا جیسا کہ جڑی بوٹیوں سے حکیم نسخے تیار کرتے ہیں۔

افلاطون نے ایک نکتہ بھی بتایا تھا جس کو ذاکر صاحب اپنے تعلیمی فلسفہ کی جان قرار دیتے ہیں۔ علم کی تحصیل صرف برائے تبدیلی ہی نہیں۔ یہ تبدیلی مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے جیسا کہ ایٹمی طاقت سے فائدہ بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی۔ اگر ایٹمی ہتھیار تیار کر دیا جائے تو نقصان ہی نقصان ہوگا اس لیے تبدیلی یا ٹکنالوجی کا بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ وہ انسان کی بھلائی، فلاح و بہبود، محبت و ہمدردی اور انسانیت ہے یعنی تعلیم کے تین درجے ہیں۔ پہلا معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرنا، دوسرا ان معلومات کا جوہر اخذ کرنا اور تیسرا اس جوہر سے اخلاقی شخصیت کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ تینوں عمل ظہور میں آ گئے ہوں تو انسان تعلیم یافتہ کہلا سکتا ہے۔ علم، عمل، اخلاق، کڑیاں ہیں تعلیم کی۔ علم حالات کے جاننے کو کہتے ہیں۔ عمل حالات کے جوہر کو کھینچنے کو کہتے ہیں اور اخلاق یا عقل یا حکمت اس عمل کو کہتے ہیں۔ جس سے انسانیت بنتی ہے۔ تصوف میں ان تین درجوں کو علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کہتے ہیں۔ اگر تصوف کو درمیان میں نہ لایا جائے اور صرف اخلاقی شخصیت مدعا ہو تو علم و عمل کا مقصد انسانیت کی قدریں حاصل کرنا ہے۔ ذاکر صاحب کے نزدیک یہ قدریں، استقلال، ایمانداری، حق و انصاف

رحم و کرم، محبت و ہمدردی، صدق و صفا، محبت و مروت ہیں۔ اگر ایک تعلیم یافتہ میں یہ قدریں نہ ہوں تو اس کی ڈگریاں بیکار ہیں۔

ذاکر صاحب ہمارے دیش کے تعلیمی معاملات میں مفکر اعظم ہیں۔ وہ فرد کی تعلیم کو تعلیم نہیں سمجھتے۔ اصل چیز اور ابتدائی سماج ہے۔ ذہنی زندگی جو تعلیم کا اصل مقصد ہے بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آ سکتا ہے مگر پورے انسان کی حیثیت سے، جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے، اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی کسی اور ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے۔ ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لیے ذہنی زندگی کے لیے سماج کا وجود لازمی ہے۔ درخت میں ہر ڈال اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے۔ ڈالی یا پتی ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا، مگر درخت سے الگ ہو کر ڈالی اور پتی کے لیے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں۔ ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قائم رہنے کا۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتا وہ اپنے وجود کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل اور دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو۔

ذاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ بہت گہرا ہے۔ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے اور یہ پرورش ذہن کو غذا پہنچانے سے ہوتی ہے۔ ذہن کو غذا ملتی ہے تمدن سے اور تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے اصولوں سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق کے اصولوں سے، سماج کے قانون سے، سماج کے رسم و رواج سے، سماج کی بڑی بڑی شخصیتوں سے، سماج میں خاندانی زندگی کے نمونوں سے اور سماج کے مدرسوں سے۔ غرض ذاکر صاحب کے نظام تعلیم میں فرد کی زندگی سماج کے جوہر قبول کرنے میں مضمر ہے۔

سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب انسانی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اس کی بنائی ہوئی چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں خود اس کی شخصیت کے علاوہ اس کی قوم، نسل، اس وقت اور اس جگہ کے حالات کا اثر بھی رہتا ہے۔ جب کوئی دوسرا ذہن ان چیزوں کو قبول کرتا ہے تو جو کیفیتیں ان چیزوں میں موجود ہیں وہ ابھرتی ہیں اور جاگتی ہیں اور اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹ جائے تو ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا چھپایا تھا، سلایا تھا۔ کوئی شخص [illegible] کی مذہبی زندگی۔ عمر بھر پڑھتا رہے یا سنتا رہے کچھ فائدہ نہ ہوگا جب تک کہ اس کے ذہن میں اس تذکرے سے مذہب کی سچی کیفیت بیدار نہ ہو۔

ڈاکر صاحب ذہن کی بیداری کو تعلیم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا تعلیمی طریقہ اب تک مانے ہوئے اصولوں سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ استاد کا کام بچوں کی ذہنی تربیت ہے، صرف معلومات کی فراہمی نہیں۔ ہمارا بچہ گویا ایک غار کی تاریکی میں پھنسا ہے۔ وہ آنکھ رکھتے ہوئے بھی دیکھ نہیں سکتا، اس لیے کہ غار میں روشنی نہیں ہے۔ استاد کا کام طالب علم کو غار کے اس طرف لے جانا ہے جہاں سورج کی روشنی پہنچ رہی ہے۔ وہ بچے کو بصارت کے لیے اپنی آنکھ نہیں دے سکتا ہے۔ بچے کے پاس بھی آنکھ موجود ہے، صرف اس کا رخ موڑنا ہے تاکہ روشنی نظر آئے۔ تعلیم کا بھی یہی حال ہے کہ تمدنی اشیاء میں روشنی موجود ہے۔ فلسفہ، ادب، سائنس، مذہب، اخلاقیات، غرض تمدن کی ہر شے میں انسانی کمالات، جمالات چھپے ہوئے ہیں، ان کمالات کی طرف استاد بچے کا ذہن مبذول کراتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ ان چھپے ہوئے کمالات کو وہی زندگی بخشے جو مصنف کے ذہن میں ان خیالات کے اظہار کے وقت رونما ہوئی تھی

ڈاکر صاحب کا تعلیمی فلسفہ آسانی سے نہیں بنا۔ وہ آفاقی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ساری دنیا کے اور سارے زمانوں کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ اپنے فلسفے میں سمویا ہے۔ افلاطون سے لے کر انگلستان کے فرانسس بیکن، امریکہ کے ڈیوی

جرمنی کے کرشنس ٹینر (KERSCHENS TEINER) فرانس کے سارتر (SARTRE)
اور اپنے دیش کے گاندھی جی کے تجربات اور خیالات کو لے کر اعلیٰ فلسفہ کی کسوٹی پر
گھس کر اپنے فکر و تحقیق کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پھر اس سانچے کو ہندوستان کے
کروڑوں باشندوں کی مختلف ضروریات، احساسات، تہذیبی، سماجی و اقتصادی
تفرقات، اور مذہبی امتیازات کے مد نظر ان میں ضروری ترمیمات کیے گئے ہیں۔ ان
کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بنایا ہوا تعلیمی دستور العمل جو بنیادی تعلیم (BASIC
EDUCATION) کہلاتا ہے ملک میں رائج کر دیا جائے۔ اس اسکیم کے پیچھے مسلسل دس سال
تک ۱۹۳۷ سے ۱۹۴۷ تک انھوں نے جان توڑ کوشش کی کئی کمیٹیاں بنیں، کئی قراردادیں
کئی تجویزیں پاس ہوئیں۔ مگر ملک نے اس کو قبولیت کا شرف نہیں بخشا۔ کبھی سیاست
کی طرف سے رکاوٹ پڑی، کبھی حکومتوں کی بے اتفاقی، کبھی عہدہ داروں کی ہٹ دھرمی
اور کبھی ماہرین کی آپسی کشمکش کی وجہ سے اسکیم شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔

بنیادی مدرسے کتابوں کے مدرسوں سے الگ تھے۔ وہ کام کے مدرسے تھے۔ کام
کو تعلیم میں ایسا ملا دیا گیا تھا جیسے جسم میں جان۔ لیکن ہر کام تعلیمی کام نہیں تھا۔ یہیں
ذاکر صاحب کے فکر کی بلندی ہے۔ وہی کام تعلیمی کام ہوگا۔ جس سے ذہن کی تربیت
ہو۔ آدمی اچھا آدمی بنے۔ یہ کام دماغ کا کام بھی ہو سکتا ہے یا ہاتھ کا کام بھی ہو سکتا
ہے۔ کوئی کام تعلیمی کام اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس کے شروع میں ذہن کچھ
تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام مردہ مشین بھی کر سکتی ہے۔ اس
سے ذہن کی تعلیم یا تربیت نہیں ہوتی۔ کام سے پہلے کام کا نقشہ یا کام کا خاکہ ذہن
میں بنانا ضروری ہے۔ دوسرا قدم اس نقشہ کو پورا کرنے کے ذریعہ سوچنا ہوگا۔ تیسرا
قدم اس کام کو انجام تک پہنچانا ہوگا اور چوتھا قدم کیے ہوئے کام کو پرکھنا ہوگا کہ
جو نقشہ بنایا تھا کام اسی طرح ہوا ہے یا نہیں۔ اگر یہ چاروں منزلیں طے ہوں تو بھی
کام تعلیمی کام نہ ہوگا۔ ایسے کام سے کچھ ہنرمندی حاصل ہوگی مگر ہنرمندی تعلیم نہیں۔
ہنرمند چور بھی ہوتے ہیں۔ ہنرمند دھوکہ بھی دیتے ہیں تعلیم کے کام میں قدروں کی خدمت
ضروری ہے جو ہماری خود غرضی سے پرے ہو۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ
تعلیم پا جاتا ہے، آدمی بنتا ہے، اخلاق سنوارتا ہے۔ کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام

ہر نتیجے پر راضی نہیں ہوتا۔ کام وقت کاٹ دینے کا نام نہیں ہے۔ کام کھیل نہیں ہے۔ کام با مقصد محنت ہے۔ کام دشمن کی طرح اپنا محاسبہ آپ کرتا ہے۔ کام ریاضت ہے۔ کام عبادت ہے۔

لیکن ریاضت اور عبادت میں بھی لوگ خود غرض ہو جاتے ہیں۔ اپنی جنت بک کر لیتے ہیں۔ کام کے سچے مدرسے میں خود غرضی نہیں ہوتی۔ مدرسے میں سب کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ سب کے کام ہی سے سب کام پورا ہوتا ہے۔ سب سے سب کا کام نکلتا ہے اور سب کے کیے بغیر کام بگڑتا ہے۔ کسی ایک کی غلطی سے سب کے کام کا ہرج ہوتا ہے۔ سب کے مل جل کر کام کرنے سے وہ صفات پیدا ہوتی ہیں جس کی ہمارے ملک میں بڑی کمی ہے۔ کام کا اچھا مدرسہ اس مدرسے کے سماج کو بھی اونچے مقصد پر لے آتا ہے۔ ذاکر صاحب کام کے اچھے مدرسوں سے سارے سماج یا ساری قوم کو بلندی اور ترقی کی طرف لے جانا چاہتے تھے، یعنی ایسی تعلیم قوم کے بہترین مستقبل کی ضامن ہو سکتی ہے۔

بنیادی تعلیم کا مقصد سب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے کم سے کم سات سال کی مفت تعلیم کا انتظام کرنا تھا اور اسے لازمی بنانا تھا۔ ہو سکے تو سات سال سے زیادہ کی تعلیم کا بندوبست ہو لیکن سات سال تک تعلیم میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ مفت تعلیم ہوگی اور لازمی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ سات سال کی تعلیم مادری زبان میں ہوگی۔ تیسری بات یہ کہ ان سات سال میں کام کو بیچ کی جگہ یا مرکزی حیثیت دی جائے گی اور چوتھی بات یہ کہ تعلیم میں تمدنی رشتہ کا امتزاج زیادہ ہو۔ ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں۔ مذہب علاحدہ علاحدہ ہیں۔ بنیادی تعلیم میں یہ خاص خیال رکھا گیا تھا کہ ہر صوبے اور ہر گروہ کو جس کا تمدنی اثاثہ ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی راہیں نکالے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں۔ ذاکر صاحب نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۴ راگست ۱۹۳۵ء میں کہا تھا: "آپ مجھے معاف فرمائیں اگر ایسی

محترم مجھے کس صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور قائم کر سکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے احسانات صرف تعلیمی میدان میں ہی نہیں۔ ان کے دل میں ملک و قوم کے لیے کتنا درد تھا۔ ان کے ان جملوں سے ظاہر ہے "تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا ہی غریب ملک ہے وہ غلاموں کا ملک ہے، محتاجوں کا ملک ہے، بے اتفاقیوں کا ملک ہے، بے ہنروں کا ملک ہے، فاقہ زدوں کا ملک ہے، پستی کا ملک ہے۔ افلاس و ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجیے تمہارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے، اور اسی میں مرنا ہے، اس لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے"..... ہمارے دیس کو ہمارے گردوں سے بہتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی، ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قضیوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ہے ان میں صدیوں تک کے لیے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔"

جامعہ ملیہ کس جانفشانی سے انھوں نے بنایا ان کے اس خطبے سے عیاں ہے جو جشن سیمیں کے خاص جلسے میں ۷، نومبر ۱۹۴۶ء کو پڑھا تھا۔ "جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں، ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پلک جھپکتے

ابھی پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے، وطن بندی ہے، مادی وسائل کا تجزیہ ہے، سمت تک سے سپنا ہوتا ہے اور دہقان کو ذہنی پریشانی کا پسینہ آ لیتا ہے۔ یہاں تنہا مدرسے میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں اخوت جنگل کی طرح پھیلتی بھی دیتی ہوتی ہیں ۔۔۔
اگر عمر کے لیے تھوڑے سے دنوں میں ہو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں آگیے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، عبرت کر اپنا سکیں، جہاں ان کے لیے شعار تعلیمی اور تمدنی مسائل پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل درس اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پروان چڑھ جائے اور رحمت اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور سایہ دار درخت بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو، وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے، اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔"

پھر پنڈت جواہر لعل نہرو اور محمد علی جناح کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا "آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں آپ کے لیے جگہ ہے ۔۔۔ آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسائے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ ۔۔۔۔ آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا، مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ

معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کردوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں تحفظ خود کا یقیناً ایک فطری اور دیس کے مستقبل کا ایک تصور قایم کرسکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حالت میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں۔ اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستانی کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

ذاکر صاحب کے احساسات صرف تعلیمی میدان ہی میں نہیں۔ ان کے دل میں ملک و قوم کے لیے کتنا درد تھا۔ ان کے ان جملوں سے ظاہر ہے "تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے اتفاقیوں کا ملک ہے، بے رنگیوں کا ملک ہے، ذلیل ناداروں کا ملک ہے، پستی کا ملک ہے۔ افلاس و ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے، غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجیے، تمہارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے، اس لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے"...... ہمارے دیس کو بہادری گردنوں سے اپنے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینے کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی، ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھوئیں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں، کانفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قضیوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ہے ان میں صدیوں تک کے لیے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔"

جامعہ ملیہ کس جانفشانی سے انھوں نے بنایا ان کے اس خطبے سے عیاں ہے جو جشن سیمیں کے خاص جلسے میں ۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء کو پڑھا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پلک جھپکتے

یعنی پھیل جائے اور ہمارے ماحول کو خاکستر بنا دے، رجعت پسندی ہے، مادی وسائل کا
تھوڑے سے دولت مندوں کے لیے سمیٹنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک دانہ
نہیں ملتا، جس میں دولت ہوتا ہے، اور جہاں اخوت جنگ کی پھلجھڑیاں لگی ہوتی ہیں۔۔۔
اگر عمر کے اپنے تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی گھٹے نہیں ہوں اس لیے کہ ادارے
کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دلوں میں آگئے جہاں لوگ یہی
اسلامی زندگی دیکھ سکیں، بسر کر سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی
مسائل پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جہاں شخصیت کی نشوونما کا سامان ہو، جہاں
مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل دین اور زندگی کی ہم آہنگ فضا
میں پرورش پائے اور رحمت اللعالمین کے چمن کے نونہال پائیں اور سایہ دار درخت
بنیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو اور ہر جگہ سے
محبت کو یوں کہ ان کا کھویا ہوا دل ہے۔ اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی ایجاد زندگی کے
موتی بکھیریں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔"

پھر پنڈت جواہر لعل نہرو اور محمد علی جناح کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا: آپ
سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دل میں
آپ کے لیے جگہ ہے۔۔۔ آج ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا
چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین
کو جھلسائے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں
گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟
بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گار
کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟
۔۔۔ آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں
معصوم بچے بھی محفوظ نہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے
ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے
دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے
پہلے مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ

وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھایئے یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لیے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجیے۔

ڈاکٹر صاحب ایک معلم کی حیثیت سے، ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے، ایک محب قوم اور محب ملت کی حیثیت سے یہ پیغام دیتے ہیں کہ اخلاقی شخصیت کا تشکل سب سے گراں بہا متاع فرد ہے۔ اس پر فرشتے رشک کر سکتے ہیں اور خالق کائنات اپنے شاہکار پر ناز کر سکتا ہے۔ اس شخصیت کے لیے سیرت بنانی ہوگی اور یہ سیرت شعوری طور پر اقدار عالیہ مطلقہ (HIGHEST ABSOLUTE VALUES) کی عبادت کرتی رہے گی۔ اخلاقی شخصیت بندۂ مومن اور مرد مجاہد کے بلند مرتبہ پر پہنچا دے گی۔ اس کے لیے قدرت نے جو صلاحیتیں، جو قوتیں، جو جبلتیں، جو استعدادیں، جو میلانات اور جو خواہشات عطا فرمائی ہیں ان میں نظم اور توازن پیدا کرنا ہوگا۔ ان میں یک جہتی اور یک سوئی کی تدبیریں کرنی ہوں گی۔ انفرادیت سے فطرت بنتی ہے، سیرت سے شخصیت اور شخصیت سے مرد مجاہد و مرد مومن۔ سیرت کی تعمیر کے لیے ارادے کی قوت چاہیے۔ اجتہاد فکر چاہیے۔ علم و فن کا ذخیرہ چاہیے۔ اثر پذیری، گہرائی و پائیداری و مستقل مزاجی سے عمل کا سلسلہ چاہیے۔ انفرادی خود غرضی کی جگہ جماعتی خدمت کا جذبہ چاہیے۔ عادتوں کو بصیرت میں بدلنے کی مشق چاہیے۔ فوق البشر کا تصور آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیے۔ خلافت کو اپنی زندگی کا افتخار سمجھنا چاہیے۔

نصب العین اور اخلاقی شخصیت کا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دیس ذات پات مذہب اور ملتوں کے فرق سے ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے۔ جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان کو پانی اور ہندو کو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رہتے ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ رکھنے کے لیے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لیے یکجا کر رکھا ہے۔ "اس ملک میں سب کو مل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ یک گونہ خود غرضی، ایک بہت دم خم، ایک کوتاہ اندیشی، بسا اوقات

قوموں کی قوموں کے لیے زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ زندگی کا دھارا ایک مقام پر نہیں پڑتا۔ حالات کا تغیر نئے انتظام چاہتا ہے۔ ایک نیا تصورِ حیات سیاسی اور معاشرتی زندگی کی بنیادوں کو ہلا دیتا ہے۔ ایک کٹر پاک اپنی جڑوں کو تمیز انسانی میں مضبوط کر کے اپنی شاخیں آسمان تک پہنچا سکتا ہے۔ ایک صحیح زندگی کا اسوۂ حسنہ کروڑوں زندگیوں کے حالات کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک گمراہ خیال ہزاروں زندگی کو مسموم کر سکتا ہے۔ اس لیے گندے خیال کو چھوڑ کر ذہن کو اچھے خیالات میں لگانا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ماضی منزل نہیں۔ رفعتِ سفر فراہم کرنے کا ذریعہ ہے۔ تعلیم و تربیت کے میدان میں ماضی کی تمام تفصیلات ذہنی آسودگی کی ضمانت ہیں۔ کیونکہ یہی زندگی کی غذا بنتی ہیں۔ انسانی ذہن اپنی کونوں کو مختلف اشیاء میں چھپا دیتا ہے۔ جب کوئی دوسرا ذہن اسی طرح پہلے ذہن سے کوئی مناسبت رکھنے والی شے کے تذکرے سے دوچار ہوتا ہے تو یہ باتیں آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ذہن نئے کی کاوش سے تربیت پاتا ہے۔ مثلاً افلاطون نے کہا تھا کہ اس دنیا میں معرفت کے تین بنیادی اصول ہیں۔ حق یعنی سچائی، جمالیات یعنی حسن اور عدل یعنی انصاف۔ یہ قدریں ایسی ہیں کہ جن کی تعریف ممکن نہیں۔ میرے نزدیک جو چیز سچائی ہے وہ دوسروں کے پاس نہ ہو۔ حسن اور انصاف کا بھی یہی حال ہے۔ مگر ان قدروں میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ افلاطون سے لے کر آج تک وہ کئی نظریوں کی بنیاد بن گئی ہیں۔ افلاطون نے ماضی میں ان قدروں میں قدروں کا تذکرہ کیا تھا، لیکن یہ تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے ماضی منزل نہیں، ذریعہ ہے۔ افلاطون کے خیالات کی اہمیت ہمارے ذہن میں نکھار آئی۔ ان قدروں کے معنی ہم دریافت کر سکتے ہیں۔ گویا افلاطون ہمارے لیے حقیقتوں کا ایک عظیم اثاثہ چھوڑ گیا ہے اور اس میراث کی کاوش ہمیشہ جاری رہے گی۔ وہ زندگی کی غذا بن جائے گی۔ تہذیب و تمدن کا سرمایہ ثابت ہوگی۔ لیکن ان قدروں کی تردید صرف افلاطونوں سے ممکن ہے جو ان قدروں پر دسترس رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا ذہن افلاطون کے ذہن سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتا ہو۔ غرض ڈاکٹر صاحب کا تعلیمی فلسفہ بہت گہرا تھا۔

اب ہم ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے چند اور پہلوؤں پر نظر ڈالیں گے۔ وہ قوم کے رہبر تھے آن کی۔ میری اس وقت سے شناسائی ہے جب کہ انہیں ایم۔ اے کی ڈگری ملی

پھر جو دن ہوئے تھے۔ ان کا ایک انقلاب انگیز مضمون "ابدیت یا کھلونا" (ETERNITY OR TOY) علی گڑھ میگزین کی مارچ۔ اگست ۱۹۲۰ء کی جلد میں چھپا جس میں علی گڑھ تحریک کے خلاف سخت نکتہ چینی تھی۔ اس زمانے میں خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون اور ترک موالات کا چرچا سارے ملک میں ایک نیا ولولہ پیدا کر رہا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، اور ڈاکٹر انصاری خلافت تحریک کے روح رواں تھے چونکہ خلافت تحریک کو بھی گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے اپنا لیا تھا، سارے دیش میں ہندو مسلم بھائی بھائی ہو گئے تھے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کی ساری تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا دور ہوگا جب کہ ہندو مسلم اتنا قریب آئے ہوں۔ ذاکر صاحب نوجوانوں کی طرف سے اس تحریک کے علمبردار تھے۔ حریت و آزادی کا جذبہ، قوم و ملت کی غیرت کا احساس اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کی یاد ان کے دل میں اس وقت بھی موجزن تھی جب کہ وہ اٹاوہ مسلم ہائی اسکول میں طالب علم تھے۔ مشکل سے چودہ پندرہ برس کی عمر ہوگی۔ جب کہ ۱۳-۱۹۱۲ء کی بلقان کی جنگ چھڑی تھی اور عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹ پڑا تھا۔ اس وقت ذاکر صاحب ترکوں کی مدد کے لیے مسجدوں میں چندہ وصول کرتے تھے اور اس انداز سے پیسہ مانگتے تھے کہ چندہ دینے والا بھی اصلی ترکی ٹوپیاں میں، جو کاسۂ گدائی بغرض اعانت ملت اسلامیہ بن چکی تھی، کچھ نہ کچھ ڈال دیتا تھا۔ دل کی گہرائی سے یہ بول نکلتے تھے "آؤ آپ کے تانبے کے پیسے گولی کی شکل میں دشمن کے سینے کو چھلنی کر دیں گے۔ سکے ڈالے جائیں اور ملت اسلامیہ کا پرچم بلند کرتے جائیں"۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مغربی ممالک نے جرمنی کی شہنشاہیت کو ختم کیا تو ترکوں پر بھی وہ مصیبت آئی کہ ان کی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور اسلامی خلافت پر بھی آنچ آئی۔

تیرہ سو سال سے خلافت کی مسند جو زندہ تھی اس پر جب حملہ ہوا تو مسلمانان ہند غیظ و غضب سے بے قابو ہو گئے۔ چونکہ ترکوں کے تنزل میں انگریزوں کا بڑا ہاتھ تھا، ہندوستان کے مسلمان جس نے اب تک جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ نہیں دیا تھا، فوراً اپنی پالیسی کو بدلا، کانگریس میں شرکت کی اور مہاتما گاندھی و مولانا محمد علی آپس میں دودھ اور شکر کی طرح مل گئے۔ ذاکر صاحب کے آنکھوں کے سامنے یہ سارا

ڈرامہ ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی اسٹیج پر آئے اور اپنا رول بحیثیت مسلم نوجوان بڑی
شد و مد سے ادا کیا۔ کانگریس کا نام نیشنلسٹ مسلمانوں کی صف اول میں آنا شروع ہو گیا۔ اس
ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کے لیے انگریز علی گڑھ کو استعمال کرنے لگے۔ علی گڑھ کو یونیورسٹی
کا درجہ دینے کی شرط پر مسلمانوں کو کانگریس سے دور رکھا۔ علی گڑھ کے ٹرسٹیز انگریزوں
کے دام میں آگئے اور کانگریس کی قیادت میں قومی تعلیم کے چرچے ہو رہے تھے۔
ان کی مخالفت کرنے لگے۔ ایسے نازک وقت میں خود علی گڑھ میں رہ کر ذاکر صاحب نے
اپنے "ابدیت یا کھلونا" والے مضمون میں علی گڑھ پالیسی کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ ایک
ایسا پر مغز مضمون تھا کہ ٹرسٹیز تھرا گئے۔ یہاں سے ذاکر صاحب کی نیشنلسٹ پالیسی
شروع ہوتی ہے۔

ذاکر صاحب نے سیاسی ہنگاموں میں حصہ نہیں لیا لیکن تحریک آزادی کے تعلیمی
پہلو کا پورا پورا حق ادا کیا۔ جب ملک میں تین قومی ادارے بنے تھے: ایک کاشی
ودیاپیٹھ، دوسرا احمدآباد میں گاندھی ودیاپیٹھ، اور تیسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ، تو ارادہ یہ
تھا کہ علی گڑھ کالج کو ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ بنا دیا جائے۔ علی گڑھ کے ٹرسٹیز نے
اس کو رد کر دیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ کو علی گڑھ کی جامع مسجد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی
صدارت میں علی گڑھ ہی میں ایک دوسرا ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کر
دیا گیا۔ مولانا محمد علی امیر جامعہ بنے۔ کرایہ کے چند مکانوں میں مدرسہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی
ابتدا سے ذاکر صاحب کا اس میں کافی حصہ رہا۔ جو جو مشکلات اس ادارے کو پیش آئیں
اور جس ہمت و استقلال و دوراندیشی و کاوش سے جناب ہماری تعلیمی تاریخ میں سنہرے
حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ اس کی ناکامی، قوم کی ناقدری، سرمایہ کی کمی، حکومت کا
دباؤ، خلافت کمیٹی کا خاتمہ، ذاکر صاحب کا ۱۹۲۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا جانا
اور ۱۹۲۵ء میں حکیم اجمل خاں کا انتقال جنہوں نے اس ادارہ کا سارا بوجھ اپنے سر لے رکھا تھا،
جامعہ کے لیے نزع کی حالت پیدا کر دی۔ آخری ہچکی آنے ہی والی تھی کہ ذاکر صاحب کا تار
آیا کہ ان کی آمد تک مریض کو نزع کی حالت میں ہی رکھا جائے اور کوئی ایسی حرکت نہ
کی جائے جس سے روح قبض ہو جائے۔

چنانچہ ۱۹۲۶ء میں ذاکر صاحب جرمنی سے لوٹے اور اس بلکتے ہوئے مریض کے

علاج اور تیمارداری میں لگ گئے۔ مسلسل بیس بائیس سال اس ادارے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ ادارہ بنا کر اپنا تن من دھن سب اس پر قربان کر دیا۔ مصیبتیں جھیلیں، قوم کے طعنے سنے، حکومت کی سختیاں برداشت کیں۔ اپنے ہی بچے ہمدرد دوست رفقا نے کام کو دھکیلا۔ علی گڑھ سے ہجرت کر کے دلی کے قرول باغ میں کرایہ کے مکانوں میں بڑی بے سروسامانی کی حالت میں پایا۔ تو ہی کیا ستم ہے میں یہاں لگ گئے کہ لوگوں نے کہا کہ ریگستان میں پھول کھلانے جا رہے ہیں۔ ان کی اخلاقی جرأت تھی کہ جواب عرض تھا کہ ان اس ریگستان سے ہی ایک دن علم و حکمت کے ایسے چشمے پھوٹ نکلیں گے جو سارے ملک و قوم کو سیراب کر دیں گے۔ مالک کا لاکھ شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے خواب کی تعبیر صحیح نکلی اور ان کے دل کی پکار عرش معلی تک پہنچ کر بارگاہ ایزدی میں شرف قبول حاصل کیا۔

مگر اس ادارہ کو اپنے خون جگر سے سینچنا پڑا۔ صرف ایک مثال کافی ہے۔ قدرت نے ڈاکٹر صاحب کو تین صاحبزادیاں عطا کی تھیں۔ ایک تو محترمہ سعیدہ خورشید عالم صاحبہ دوسری محترمہ صفیہ ظل الرحمن صاحبہ، اور تیسری سب سے چھوٹی، منی، پیاری رقیہ۔ رقیہ ایک بیماری کی وجہ سے سخت بیمار ہو گئیں۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب مدرسے میں تھے۔ بچوں کو امتحان کے نتیجے سنا رہے تھے اور جائزے بانٹ رہے تھے۔ اتنے میں ایک ملازم آیا اور کان میں کچھ کہا جس سے ڈاکٹر صاحب مضطرب ہوئے، لیکن اپنا کام جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد ایک اور صاحب نے آکر کچھ کہا جس سے ڈاکٹر صاحب کی اضطرابی اور بڑھ گئی مگر کام نہ رکا۔ چند لمحوں بعد جب کہ کام پورا ہو چکا تھا کسی اور کے کہنے سے دوڑے آئے اور انھیں گھر لے گئے۔ ملازم جب پہلی بار آیا تو رقیہ کی حالت نہایت نازک تھی۔ دوسری بار جب کوئی صاحب آئے تو رقیہ جاں بلب تھیں، اور تیسری بار جب لوگ دوڑے آئے تو رقیہ اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ جب ڈاکٹر صاحب گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ کو غم و اندوہ میں پایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی دوسری بچی صفیہ کو گود میں لیا اور خوب چوما، گویا بیگم صاحبہ سے یہ اشارہ تھا کہ اللہ کا شکر کرو کہ مالک کے دیے ہوئے تین میں سے ایک ہی بدلی، دو ہمارے پاس موجود ہیں۔ جو دیا تھا اسے لیا تو ہم کون؟ اللہ کے بندے اس کی رضا میں اپنی فلاح جانتے ہیں۔ مالک سے ہم کو یہ دعا نہیں مانگنی چاہیے کہ جو ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں عطا ہو بلکہ یہ دعا مانگنا ہوگا کہ مالک کی رضا ہم سے پوری ہو، وہ ادا ہو سکے۔ یہ ایثار و قربانی بہتوں نے کی

ہے۔ لیکن ذاکر صاحب کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آئے گی۔

بمبئی کے حارث صاحب ان کے بڑے عقیدت مند شاگرد تھے۔ جامعہ کے لیے چندے کی وصول کے لیے ذاکر صاحب کو بمبئی جانا پڑا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ جامعہ کو سرکار سے کوئی تائید نہیں مل رہی تھی اور نہ ذاکر صاحب کچھ لینا پسند کرتے تھے۔ بمبئی میں حارث صاحب گلی گلی کوچہ کوچہ ذاکر صاحب کو پیدل لے گئے۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب سے مزید چلا نہ گیا تو حارث صاحب سے کہنے لگے "حارث صاحب خدا کے لیے ایک ٹیکسی کیجیے، یہ دیکھیے کہ چلتے چلتے پیر میں چھالے پڑ گئے ہیں۔" مسلسل بیس بائیس سال اپنی اور فیملی کی زندگی صرف چالیس روپیہ ماہوار میں بسر کیا، کبھی کبھی یہ رقم بھی انھیں مہیا نہیں ہوتی تھی کہیں سے کچھ پیسہ آجاتا تو پہلے دوسروں کی ضروریات کے لیے دے دیتے اور کچھ رہتا تو خود کے لیے تھا، ورنہ نہیں۔ ان کی علمی قابلیت، استعداد، اور جرمنی کی ڈگری کے بل بوتے وہ اگر چاہتے تو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ پا کر آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ انھوں نے سرکاری نوکری کو پائے حقارت سے ٹھکرایا اور جامعہ کے لیے اتنی تنگی سہی کہ زندگی کی بالکل اہم ضروریات سے بھی محروم رہے۔

ایک مرتبہ کئی برسوں کے بعد بیگم صاحبہ اپنی بچت سے ایک نیا لحاف خرید لائیں۔ دوسرے ہی دن وہ غائب تھا۔ کیرالا کا ایک غریب لڑکا سردی میں ٹھٹھر رہا تھا تو ذاکر صاحب نے وہ اس کو دے دیا۔ اس تنگ دستی میں بھی دریا دلی ایسی تھی کہ کوئی سائل خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بیمار تھے۔ بیگم صاحبہ بھی اپنی بستی قائم گنج گئی ہوئی تھیں۔ کوئی صاحب آئے اور پیسے مانگنے لگے تو ذاکر صاحب نے کہا کہ فی الحال ان کے پاس کچھ نہیں ہے، بیگم صاحبہ بھی موجود نہیں اور طبیعت بھی ناساز ہے۔ سائل نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ ان کے پاس کچھ نہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بیگم صاحبہ موجود نہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بیمار ہیں۔ لیکن اب جو سوال کر چکا ہوں ذاکر صاحب کے پاس سے کیسے خالی ہاتھ جاؤں؟ ذاکر صاحب نے فوراً اپنے سکریٹری کو چٹھی لکھ دی کہ مہمان کی حاجت روائی کر دی جائے۔ مہمان نوازی ایسی کہ بسا اوقات بغیر اطلاع کے کئی مہمان گھر لے آئے اور بیگم صاحبہ بھی ایسی سلیقہ شعار تھیں کہ سب کچھ کر کے سارے مہمان بلا دے سے ہی آگئے ہیں۔ ذاکر صاحب میں سچائی، صبر، قناعت،

وہ سخاوت اس قدر تھی گویا انھوں نے اس آیت کریمہ کو اپنا اصول بنا رکھا تھا جہاں کہا گیا ہے " وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰبِرِیْنَ، وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ. وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ " وہ دکھاوے کی سخاوت کے عادی نہیں تھے۔

ان کی ایک کہانی "آخری قدم" خود اُن کی زندگی کی ترجمان ہے۔ اس کہانی میں ایک صاحب بظاہر قارون نظر آتے تھے۔ لیکن چھپی سخاوت اس قدر تھی کہ مددوں کی فہرست سے ایک رجسٹر بھر گیا تھا۔ اُن کی یہ عادت تھی کہ جو کچھ دیتے وہ ایک رجسٹر میں لکھ ڈالتے۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ لوگ مجھے بخیل سمجھتے ہیں لیکن میرے مرنے کے بعد جس کسی کی نظر اس رجسٹر پر پڑے گی تو پتہ چل جائے گا کہ میں وہ نہیں تھا جو سمجھا گیا تھا۔ جب ان صاحب کا آخری وقت آیا تو انھیں بستر مرگ پر یہ خیال ستانے لگا کہ وہ آخرت کے پاس کس قدر چھوٹا ثواب ساتھ لیے جا رہا ہے کہ کچھ مدت کے بعد اس کی سخاوت کا شہرہ ہو۔ بعجلت ہے وہ اپنا رجسٹر تکیے کے نیچے سے نکالتا ہے اور دہکتی ہوئی انگیٹھی میں نذر آتش کر دیتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا آخری قدم تھا۔ ذاکر صاحب کی بھی یہی حالت تھی کہ کبھی کبھی قلیل تنخواہ بھی گھر نہیں پہنچتی تھی۔

اخلاق کا یہ معیار ان کی رگ و پے میں سمایا تھا۔ ابھی سکول کی طالب علمی کے زمانے میں جب وہ اٹاوہ ہائی اسکول کے بورڈنگ میں تھے تو وہاں کے ہیڈ ماسٹر مولوی محمد الطاف حسین جن کی قدر و منزلت ذاکر صاحب کبھی نہ بھولے۔ ایک مرتبہ بچوں کے تحمل کی آزمائش کے لیے سالن میں اتنا پانی ملا دیا کہ کوئی نہ کھا سکے۔ ہیڈ ماسٹر دور سے تماشا دیکھ رہے تھے کہ لڑکوں کا کیا رد عمل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کسی نے سالن کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، بجز ذاکر صاحب کے جو ایسے مزے سے کھا رہے تھے کہ گویا سالن بہت لذیذ ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور انھوں نے اسی زمانے میں پیشین گوئی کی تھی کہ یہ ہونہار ملک و ملت کے لیے مایۂ ناز ثابت ہوگا۔ ذاکر صاحب اصول کے بڑے پابند تھے۔ بڑے غیور و خود دار بھی۔ اسی ہوسٹل میں ایک مذہبی قسم کے وارڈن نے یہ قانون جاری کیا کہ جو لڑکے نماز قضا کریں گے ان کو گوشت کی طشتری نہیں ملے گی۔ اس پر ذاکر صاحب نے احتجاج بلند کیا اور منتظمین کو یہ قانون رد کرنا پڑا۔

ذاکر صاحب جو بات کہنا چاہتے تھے وہ اس سلیقہ اور ڈھنگ سے کہتے تھے کہ وہ ضرور اثر پذیر ہوتی۔ نائب صدر کا جب ایک ٹرم ختم ہوا تو حلقۂ اقتدار سے دوسری ٹرم قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی گئی۔ ذاکر صاحب کو دوسری میعاد پسند نہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اتنا کمزور نہیں کہ اس رائے کو رد نہ کر دوں، لیکن اگر صدر ہند کے لیئے نام پیش کیا گیا تو میں اتنا مضبوط نہیں کہ انکار کر سکوں۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ طبیعت میں اس قدر بھرم، وقار اور برتری تھی کہ لوگ ان کی عظمت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ صدارت کے انتخابات کا جب وقت آیا تو شنکر اچاریہ نے علی الاعلان اُن کی مخالفت کی۔ انتخابات جیت جانے کے بعد ذاکر صاحب تعظیماً شنکر اچاریہ کے پاس پہنچے۔ یہ تعجب کا مقام تھا جو شاید کسی اور صدر سے نہ ہو سکتا تھا۔

جب وہ صدر بنے اور جامعہ کے زمانے کے ایک دکاندار ستو نے انھیں ایک کارڈ لکھ کر پچھلے زمانے کی یاد دلائی تو دوسرے دن راشٹرپتی بھون سے ستو کو لینے گاڑی گئی۔ خود ذاکر صاحب اُسے لینے باہر آئے، خاطر مدارت کی اور اس کو پہنچانے کے لیے خود باہر تشریف لائے۔ پروٹوکال والوں نے بتایا کہ صدر ہند کسی بہت ہی معزز ہستی کو لینے یا پہنچانے خود تشریف لاتے ہیں۔ تو ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ پروٹوکال کے افسروں کو یہ خبر نہیں کہ یہ مہمان کتنا معزز تھا۔ یہ نہ ہوتا تو اس زمانے میں جب کہ وہ غلہ قرض دیتا تھا تو آج کے راشٹرپتی زندہ نہ ہوتے۔ پروٹوکال اپنی جگہ ہے اور انسانیت اپنی جگہ۔ جب ذاکر صاحب بیمار ہو کر کچھ سنبھلے تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ راشٹرپتی بھون میں ہی وہ چہل قدمی کریں، لیکن چند قدم چلنے کے بعد کچھ دیر بیٹھ جائیں جس کے لیے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ جب وہ چہل قدمی کر رہے تھے تو بار بار ڈاکٹر لوگ انھیں کرسی پر بیٹھ جانے کی صلاح دیتے رہے لیکن کہیں بیٹھے بغیر وہ اپنی واک پوری لیتے۔ بعد میں نہ بیٹھنے کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں کیسے بیٹھتا جب کہ ہر جگہ تین کرسیاں رکھی گئی تھیں اور ہم لوگ چار آدمی تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی انھیں گوارا نہ تھا کہ ان کی وجہ سے کسی اور کو تکلیف ہو۔

ذاکر صاحب کو پھولوں سے والہانہ عشق تھا۔ ان کی ساری زندگی ایک قسم

کی چمن بندی تھی۔ ان کے مذاق میں، ان کے کام میں، ان کے کلام میں، ان کی حرکات و سکنات میں، ہر جگہ چمن بندی تھی۔ کسی کام کو بھی اس کا پورا پورا حق ادا کیے بغیر انھیں چین نہیں آتا تھا۔ جب وہ بہار کے گورنر ہوئے اور اشکالات سے پیچھا چھوٹا تو وہاں کے راج بھون کا چمن فردوس بریں کا نظارہ پیش کرنے لگا۔ گلاب کا اتنا شوق تھا کہ ایک نئے قسم کے گلاب کا نام ان کے نام پر "ذاکر روز" رکھا گیا۔ چمن بندی میں ان کا تجربہ اچھے ماہر نباتات (BOTANIST -) سے بھی زیادہ تھا۔ صرف نباتات سے ہی نہیں جمادات سے بھی ان کا شوق اس قدر تھا کہ راشٹرپتی بھون میں ان کے اکٹھا کیے ہوئے نادر پتھروں کو دیکھنے کے لیے بھیڑ رہتی۔ جہاں جاتے پھولوں، پودوں، درختوں اور معدنیات کے نادر پتھر جمع کر کے لاتے۔ کوئی ان سے یوں پوچھ بیٹھا کہ پتھر کس کام کے؟ ایک گھنٹہ اس کو سمجھاتے رہے کہ انسان پتھر سے گیا گزرا ہے۔ یہی پتھر ہے جو کوہ نور کی صورت میں شہنشاہوں کے تاج میں جڑا جاتا ہے۔ یہی پتھر ہے جس سے مورتی تراشی جاتی ہے اور لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ یہی پتھر ہے جس کو سنگ تراش اپنے جمالیاتی حسن کا نمونہ بناتے ہیں۔ یہی پتھر ہے جو گھر کی بنیاد کے لیے مسجد کشتی کے مینار کے لیے کام آتا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ بھائی بھائی میں تفرقہ ڈالتا ہے۔ آدمیت کو پامال کر رکھا ہے اور کل جیتے جاگتے کے گلے پر پاؤں رکھ کر چلا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کا صرف تعلقات کا خیال نہیں تھا بلکہ انسانیت کا بھی بڑا احساس تھا۔ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ صدر ہند منتخب ہونے کے بعد جب عید کے لیے جامعہ گئے تو پچھلے زمانے کے ایک بوڑھے ڈرائیور صاحب دور کھڑے جھجک رہے تھے کہ صدر صاحب سے کیسے ملیں۔ ذاکر صاحب نے انھیں دیکھ لیا۔ خود آگے بڑھے اور یہ کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے "کیوں بھئی ڈرائیور صاحب آج عید کے دن آپ ہم سے نہ ملیں گے!" ہمدردی اور غمگساری کا یہ عالم تھا کہ جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور کہیں سفر سے اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ کسی چھوٹے درجے کے یونیورسٹی ملازم کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ سیدھے ملازم کے گھر پہنچے۔ تجہیز و تکفین تک رکے رہے۔ رات کے دس بج گئے۔ جب گھر آئے تو جو کھانا پکا تھا سب میت کے گھر بھیج دیا اور خود بغیر کھائے سو گئے۔

ذاکر صاحب اچھے استاد کا شاہکار تھے۔ جن کی ایک تقریر "اچھا استاد" کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ۵ مئی ۱۹۴۷ء کو نشر کی گئی جس میں انھوں نے کہا تھا "استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر "علم" نہیں لکھا ہوتا "محبت" کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے ان سے محبت ہوتی ہے۔ ان مخفی حقیقتوں سے محبت ہوتی ہے جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہیں۔" وہ جو کہتے تھے کر دکھاتے تھے۔ جامعہ میں امتحانوں کے قریب چند لڑکوں کو تاش کھیلتے اور وقت برباد کرتے دیکھ لیا۔ ان سے صرف اتنا کہا "میں بھی تمھارے ساتھ شریک ہو جاتا مگر کیا کروں تاش کھیلنا مجھے آتا ہی نہیں"۔ یہ انداز درست کام آیا کہ بچے تاڑ گئے کہ زندگی میں بلندی کے لیے چند چیزوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بچے کچھ کھا کر کاغذ پھینک دیتے تھے تو یہ کسی سے کچھ نہ کہتے۔ سارے کاغذ کے ٹکڑے اپنی جیب میں ٹھونس لیتے اور جب جیب بھر جاتی تو کوڑے کرکٹ کے ڈبے میں ڈال آتے۔ کچھ عرصہ بعد بچوں کو معلوم ہو گیا کہ نفاست کیا چیز ہے۔ ایک مرتبہ کلاس میں ایک لڑکا باوجود بار بار کوشش کے ان کے سوال کا ٹھیک جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں بات نہیں آ رہی تھی۔ ذاکر صاحب کا صرف یہی ردعمل رہا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ آنکھ کے موتی کئی برسوں کے درس سے زیادہ موثر ثابت ہوئے ہوں گے۔

اچھے استاد کی یہ نشانی ہے کہ وہ بچوں میں بچہ بن جاتا ہے اور اپنی حرکات سے بچوں کی تربیت کرتا ہے۔ اپنی علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں بورڈنگ کے ایک کمرے میں گئے تو اس کو گندہ پایا۔ ادھر ادھر انھوں نے دیکھا اور ایک جھاڑو پر نظر پڑی۔ جھٹ اس کو لیا اور لگے کمرہ صاف کرنے۔ پراکٹر صاحب حیران پریشان تھے مگر لڑکوں نے سبق سیکھ لیا کہ زندگی کا اصول یہی ہے کہ کسی کو نصیحت مت دو بلکہ خود کام کر کے بتاؤ۔ بورڈنگ کے ایک صاحب اپنی شیروانی کے بٹن لگائے بغیر سامنے آ گئے تو ذاکر صاحب نے سبقت کر کے ان کا بٹن لگا دیا اور کہا کہ میرا دفتر پاس ہی ہے۔ جب بھی آپ کو ضرورت پڑے تو آواز دیجیے اور میں آ کے بٹن لگا دیا کروں گا۔ ایک اور کمرے میں گئے تو دیکھا کہ دیوار پر فلم اسٹار ثریا کی تصویر غضب کے پوز میں لگی ہوئی ہے۔ پوچھا کہ یہ کون خاتون ہیں۔ جب جواب دیا گیا تو کہنے لگے کہ آپ نسیم بانو کی تصویر کیوں نہیں لگاتے۔ علی گڑھ کی

عام طور پر بھی بہت مشہور ہے۔ لڑکا کہنے لگا کہ ہر ایک کی پسند اپنی اپنی، حُسن کا تصور الگ الگ، جمالیاتی مذاق جدا جدا۔ مسکرا کر خاموش رہ گئے۔ بنگلور کے ایک صاحب اظہر علی علی گڑھ میں مشہور تھے۔ ایک ہی کلاس میں کئی کئی سال رکتے رہے۔ برسوں طالب علمی میں گزار دیے شرارت کی وجہ سے استاد کے نام سے موسوم تھے۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب اور رشید احمد صدیقی کہیں کھڑے بات کر رہے تھے۔ اظہر علی کا بھی وہاں سے گزر ہوا۔ رشید صاحب نے پوچھا "کہو بھائی، استاد کیا حال ہے" تو اظہر نے جواب دیا "حال بُرا ہے، غضب کی گرمی ہے، امتحان قریب ہے، کچھ تیاری نہیں ہوئی، سوچ رہا ہوں کہ امتحان دوں یا نہ دوں"۔ رشید صاحب نے فرمایا "بے وقوف لوگ بھی کبھی کبھی عقل کی بات کہہ دیتے ہیں"۔ اظہر نے فوراً ٹوکا "آپ نے بڑی عقل کی بات کہہ دی ہے"۔ ذاکر صاحب سے ہنسی روکی نہیں جاتی تھی۔ رشید صاحب سے کہہ رہے تھے کہ "اب دو جواب دو" کچھ کہنے سے پہلے اظہر وہاں سے نو دو گیارہ ہو چکے تھے۔

الغرض ذاکر صاحب کی زندگی دوسروں کے لیے وقف تھی۔ ان کے نزدیک خدمت خلق بڑی نیکی تھی۔ ان کا فلسفہ تھا کہ قدرت کی ہر شے کسی اور شے کے لیے بنائی گئی ہے۔ درخت کی ٹہنی پتی کے لیے، پتی پھول کے لیے، پھول پھل کے لیے اور پھل بیج کے لیے خود کے لیے اس میں کچھ فائدہ نہیں۔ سورج کی روشنی، چاند کی ٹھنڈک، سمندروں کا پانی ہمالیہ کا برف، پہاڑوں کے پتھر سب کچھ کسی اور کے فائدے کے لیے ہیں، خود کے فائدے کے لیے نہیں۔ انسان کی تخلیق بھی اسی غرض سے عمل میں آئی ہے کہ وہ دوسروں کے کام آئے۔ یہی خدمت کا دائرہ وسیع کرتا جائے۔ خود سے خاندان، خاندان سے بستی، بستی سے ملک و ملت، اور ملک و ملت سے ساری انسانیت کی خدمت جس کا مسلک ہے۔ شمع خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی بخشتی ہے۔ درخت لکڑہارے کو بھی اپنے سایہ سے محروم نہیں رکھتا۔ انسان ایسا نہیں کرتا، بلکہ ایک انسان دوسرے انسان کا شکاری بن جاتا ہے۔ ذاکر صاحب کا سارے کا سارا فلسفہ اسی نکتہ پر مرکوز ہے جو حالی نے کمال سادگی سے تخلیق کی حقیقت کو یوں روز روشن کی طرح عیاں کیا ہے۔

"یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا ؎ کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا" "یہی ہے عبادت
یہی دین و ایمان ؎ کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"

ڈاکٹر صاحب اس خیال کی گہرائی تک پہنچ گئے تھے اور خود عمل کرتے کرتے انسانِ کامل کے درجے تک پہنچ گئے تھے۔ مردِ مجاہد اور بندۂ مومن بن گئے تھے۔ اخلاق شخصیت کی تعمیر کرنے اور سیرت کی تربیت میں ساری عمر گنوا دی۔ ان کی ساری زندگی اسی فلسفے سے عبارت ہے کہ اوروں کے کام آؤ۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ اپنا خون پسینہ اس میں بہانا تھا۔ ان کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کیسے انھوں نے ہر قدم پر ایثار و قربانی، جہد و جہد اور یقینِ کامل سے کام لیتے ہوئے قوم کی اچھی زندگی کے لیے ساز و سامان مہیا کیا۔ یہ ساز و سامان علم کی دولت ہے۔ علم کی دولت سے بڑی دولت کوئی نہیں۔ اس علم کے چراغ کو ہمیشہ کے لیے انھوں نے جامعہ ملیہ کی صورت میں روشن کر دیا۔ علم سے بھی بڑھ کر اسی سے لگی ہوئی دولت تعلیم و تربیت ہے۔ اس تعلیم و تربیت کے بے شمار اسرار و رموز کو اپنے خطبات میں قلمبند کر دیا تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ تعلیم و تربیت کا اصل مقصد اخلاق شخصیت کی تعمیر ہے اور انسانیت کی طرف مسافت ہے۔ وہ اس مقصد کا نمونہ، اس کے حصول کا طریقہ، اس کے صحیح استعمال کا سلیقہ اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا ڈھنگ، اپنی زندگی میں چھوڑ گئے۔ ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا خود کو مٹا کر دوسروں کی مدد کرنا، ہمت، فکر و عمل سے قدرت کے تقاضوں کو عملی جامہ پہنانا، محبت و خلوص سے دوسروں کے دلوں کو گرمانا، خیر و ہمدردی سے خلق کی خدمت کرنا اور سب سے بڑھ کر ان کے ذہنوں کو تعلیم کی روشنی سے منور کرنا، ڈاکٹر صاحب کا نصب العین تھا۔

ان کی زندگی کا لب لباب یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ رب العالمین کی خلقت سے انھیں پیار رہا، اس کی خدمت ان کا وظیفہ تھا۔ رحمت اللعالمین کے نونہال بچوں سے انھیں عشق تھا، ان کی تربیت ان کا پیشہ تھا۔ ملک و قوم کے مدرسوں اور استادوں سے انھیں انس تھا، ان کی رہبری ان کا شیوہ تھا۔ علم سے رغبت، عمل سے الفت، عقل سے لگاؤ، ان کا سرمایہ تھا۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، معاشیات اور نفسیات ان کی تحقیقات کا موضوع رہا تھے۔ تحریر، تقریر، تدریس اور تفتیش ان کے علم کے خزانوں کو لٹانے کا ذریعہ تھے۔ شخصیت کی تعمیر، اخلاق کی تخلیق اور سیرت کی تربیت ان کا مشغلہ تھا۔ ذہنوں کی چمک، پھولوں کی مہک، چڑیوں کی چہک، پتھروں کی دمک اور بچوں کی

مسکراہٹ ان کی مسرت خیز تھی۔ حق و انصاف، حسن و جمال، محبت و ہمدردی ان کا شعار تھے۔ متانت و نفاست، لطافت و سنجیدگی اور وقار و غیرت ان کا اثاثہ تھے۔ مسلم کی کرسی سے کل ہند کی صدارت کا شرف، ان کی عظمت کا اقرار تھا۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو۔ رزم ہو یا بزم، پاک دل و پاکباز، سلف کا مزاج تھا۔ "تو خاک میں مل، آگ میں جل، جب خشت بنے، تب کام چلے۔" ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر" ان کا مسلک تھا۔ قومی یکجہتی، آپس کا ملاپ، ہندو مسلم اتحاد، ان کا شیوہ تھا۔ ملک کی وحدانیت اور ملک میں ایک اچھی ریاست کا قیام ان کا خواب تھا۔ جامعہ ملیہ ان کے کمالات کے عکاسی کا آئینہ تھا۔ یہ وہی جامعہ ملیہ ہے جس کے حق میں شاعر اعظم حفیظ جالندھری نے کہا تھا:۔

اُدھر تھا سا اُو دنا دلھلیا انیہ العسا تی — ابھی ایک زندہ معجزہ کا ذکر ہے باقی

رسالت کے یقینی معجزوں میں جامعہ بھی ہے — مدینہ مصری والیسینا طور لامو بھی ہے

تمام جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں — چراغ راہ ایسی تند و زہریلی ہواؤں میں

مقابل ساحلی تخریب کے، اک ید بیضا — خدائی اتنے فرعونوں کی تنہا جرأت موسیٰ

یہ قسمت تجربہ کی ابتدائیاں کاری کو جانے گی — جو دنیا معجزے کو معجزے سے کم نہ مانے گی"

اسلامی فلسفہ پر ایک نظر

فلسفہ کا لفظ لوگوں کو ایسا ڈراتا ہے، جیسے بچوں کو بھوت۔ دراصل یہ غلط خیال ہے کہ فلسفہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ ہر شخص کے کردار میں ایک فلسفہ موجود ہے چاہے اس کا علم اس کو ہو یا نہ ہو۔ وہ جو بھی کام کرے گا کسی مقصد یا غرض کی وجہ سے کرے گا۔ اس کی کامیابی کی تدابیر سوچے گا اور اس کے سارے ضروری اسباب مہیا کرے گا۔ گویا ایک لائحہ عمل تیار کرے گا۔ ایک حکمت عملی سے کام لے گا۔ یہی حکمت عملی اس کی زندگی کا فلسفہ ہوگا۔ اس کی کامیابی کا سارا انحصار اس کی حکمت عملی کے حساب سے ہوگا۔ کوئی کام عمل میں آنے سے پہلے دماغ میں خیال کا بیج بویا جاتا ہے۔ اگر اس خیال کی نوعیت سمجھ میں آجائے تو فلسفہ کا مفہوم سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ بہ الفاظ دیگر فلسفہ اس عقل و شعور کے نتائج کو کہتے ہیں جہاں مشاہدہ کام نہیں کرتا۔ اس کائنات میں کئی ایک ایسی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ قیاس کرنا پڑتا ہے، مثلاً روح، خوبصورتی، نیکی، بھلائی، سچائی، حکمت، توقیر، اخلاق، عزت، اقدار، وغیرہ وغیرہ۔ ان چیزوں کی موجودگی اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں، لیکن یہ چیزیں نہ بازار میں بکتی تھیں، جو چیزیں بازار میں بکتی ہیں اور سائنس والے جن پر تجربے کے پیمانے رکھتے ہیں وہ فلسفہ نہیں۔ فلسفہ کے لیے بازار اور لیبارٹری ضروری نہیں، صرف دماغ چاہیے اور عقل چاہیے۔ اور انسان کا عمل۔ فلسفہ علم الکلام اور علم الجمال سے تعلق رکھتا ہے۔ خیالات کے معنی دریافت کرتا ہے، ان معنوں کے بل پر ایک اصول تراشتا ہے۔ فلسفہ کا دائرہ ساری کائنات پر مسلط ہے۔ یہ علوم کی جڑ ہے، معلومات کا نچوڑ ہے، تحقیقات کا منبع ہے، انسانی

سوچ کا مرکز ہے، وجدان خیالی کا سرچشمہ ہے۔ ہر مذہب کا ذخیرہ ہے، خالق و قدرت میں رشتہ جوڑنے کا واحد ذریعہ ہے اور نامعلوم حقیقتوں پر روشنی ڈالنے کا نادر وسیلہ ہے۔

فلسفہ کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کے بعد علماء نے اس نکتہ کو کیسے سمجھا اور جانا، اس پر ایک ہلکی نظر یہاں ڈالی جا رہی ہے۔ ہمارے علماء کے نزدیک علم تین طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو سائنس کے ذریعہ جہاں تجربہ، مشاہدہ اور مادی حقائق کی تحقیق کے بعد اصول بنتے ہیں۔ دوسرا فلسفہ کے ذریعہ جہاں غیر مادی اور تخیلی اسباب پر غور و خوض کرنے کے بعد نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ تیسرا ذریعہ خدا کے برگزیدہ بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ جنہیں وحی کے ذریعہ علم و حکمت عطا کی جاتی ہے اور اس صف میں انبیاء، اولیاء آتے ہیں جو آن واحد میں کئی مراحل طے کر جاتے ہیں۔ "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق ۔۔ عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی" یہاں عقل کا دخل بہت کم ہی ہوتا ہے۔ "صحیح قول یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے ۔۔ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول" یہاں پہلا اور تیسرے ذریعہ سے بحث نہیں، صرف دوسرے ذریعہ سے ہے۔ جو فلسفہ کی زد میں آتا ہے۔

ہمارے مفکروں کو ارسطو و افلاطون کی تحقیقات بھی سچی لگتی ہیں اور قرآن کی بھی۔ لیکن یونانی تخیلات اور اسلامی تخیلات میں کچھ تضاد بھی ہے۔ ہمارے علماء و حکماء نے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی۔ یعنی مذہب و عقل کی جنگ جو چل اٹھی تھی، اس میں صلح۔ یہ بڑا مشکل امر تھا۔ مگر خوشی اس بات کی ہے کہ ایک حد تک ہمارے مفکر اپنے اس عمل میں کامیاب رہے۔ چونکہ فلسفہ غیر حقیقی تصورات کا تجزیہ کرتا ہے، اس لیے مذہبی امور کا کافی دخل ہے۔ جہاں مذہب کا نام لیا گیا وہاں خالق کی کارسازی کا انبار لگ گیا۔ خدا بینی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذات الٰہیہ پر نظر، اس کی خصوصیات کی جانچ پڑتال، کارکردگی اور قدرت کا جائزہ، در مختلف مظاہر باری پر غور و خوض، اسلامی فلسفہ کی اصل روح ہے۔ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کا حیرت انگیز نظام کس خوبی سے چلا آ رہا ہے، ہمارے فلسفہ کا یہی موضوع ہے۔ ہمارے بیشتر علوم کا عنوان ذات الٰہیہ سے ہی منسلک ہے۔ ہزاروں جلدیں اس پر سیاہ کی

گئی ہیں۔ جہاں خصوصیات الٰہیہ کا ذکر آیا وہاں علم ودانش کے کئی سرچشمے پھوٹ پڑے۔ نمازی کے ہاتھوں میں جو تسبیح ہوتی ہے اس کے سو دانے ہوتے ہیں اور ہر دانہ مالک کی کسی خاص صفت کی شہادت دیتا ہے۔ درخت کا ہر پتہ معرفت کردگار کا گانا گاتا ہے ہر صبح طائران خوش الحان "کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ" کا ورد کرتے ہیں۔ ازل سے ابد تک جو عادل وکامل ہے اس کے کمال وجمال کا پتہ دنیا کی ہر شے سے چھلکتا ہے۔ ہمارے مفکروں نے ان ذات الٰہیہ کی صفات کی کما حقہ تشریح کی ہے جو خود ہمارے علوم کا ایک نادر ذخیرہ ہے۔ ہم یہاں ان صفات میں صرف دو تین پر اشارہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں وہ ہیں ربوبیت، حکم، اور عدل۔

ربوبیت قدرت کا وہ کرشمہ ہے جس سے ہر چیز ظہور میں آتی ہے۔ یہ ارتقا کی پہلی منزل ہے۔ مالک کو ہم رب العالمین کہتے ہیں، یعنی ساری کائنات کو پیدا کرنے والا۔ خالق میں یہ قدرت ہے کہ بس اس کے ارادہ کرنے اور "کن" کے کہنے سے ہر شے ترتیب پا جاتی ہے، اور وجود میں آجاتی ہے۔ وجود میں آنے کے بعد اس کی نشو ونما بھی ربوبیت کا احسان ہے۔ نشو ونما سے گزر کر انجام کو پہنچنے کی صلاحیت بھی ربوبیت کا عطیہ ہے۔ اس ربوبیت کی تکمیل کے لیے قدرت نے دو اہم چیزیں تجویز فرما رکھی ہیں، وہ ہیں تقدیر اور ہدایت۔ تقدیر ہر شے کی قسمت کا اٹل فیصلہ سناتی ہے۔ یعنی اس کو ایک مجوزہ شرائط کے پنجرے میں بند کرکے، اس کی حدود، کار فرمائی، خصوصیت اور مقاصد کا دائرہ معین کرتی ہے، جو کبھی بدلا نہیں جا سکتا۔ جیسے ستارے اپنی گردش نہیں بدل سکتے، سمندر اپنی تہہ نہیں چھوڑ سکتے۔ مچھلی دریا نہیں چھوڑ سکتی، پرندے پانی میں بس نہیں سکتے۔ ہر شے پر پابندی لگا دی گئی ہے کہ وہ کہاں، کیسے اور کب تک رہے، اور کیا کرے۔ کائنات میں اس قسم کے نظام سے ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر شے اپنے محور یا فرائض یا مقاصد سے مجبور ہو کر اپنا اپنا کام بخوبی انجام دیتی ہے۔ سورج سے روشنی، چاند سے ٹھنڈک، آگ سے گرمی، پانی میں بہاؤ، مقناطیس میں کشش، غرض ہر نباتات، جمادات اور حیوانات میں کچھ نہ کچھ خصوصیت ودیعت کر دی گئی ہے۔ اس خصوصیت کی پابندی کو تقدیر کہتے ہیں۔ تقدیر کے ذریعہ قدرت نے حسب لاکا احکامات صادر فرما دیئے ہیں جو ان پر لازم آتے ہیں۔

انسان بھی ان احکامات سے مستثنیٰ نہیں۔ نیکی کا بدلہ نیکی ہے۔ بدی کا انجام برا ہے۔ صحت چاہیے تو صحت کے اصول پر چلنا ہوگا، عزت چاہیے تو خدمت کرنی ہوگی دولت چاہیے تو کوشش کرنی ہوگی۔ ہر چیز کے اسباب اور اثرات طے شدہ ہیں۔ اُن میں ہیر پھیر کی گنجائش نہیں۔ لیکن انسان کو تقدیر کے علاوہ ایک اور نعمت بھی بخشی گئی ہے، جو کائنات کی کسی دوسری شے کو نہیں دی گئی۔ وہ ہے ہدایت۔ ہدایت وہ روشنی ہے جو تقدیر کی لکیر کو بھی بدل سکتی ہے۔ عیسیٰ مسیح مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ موسیٰ کا عصا اژدہا بن جاتا تھا۔ ابراہیم کا ایمان آگ کو ٹھنڈا کر دیتا تھا۔ ایوب کا صبر، یعقوب کا گریہ، یوسف کا حسن، سلیمان کا علم، عام انسانوں کی تقدیر سے بالاتر تھا۔ رسول اکرمؐ کی بعثت نے دنیا میں انقلاب برپا کر ڈالا۔ یہ سب ہدایت، ربوبیت کی خاص عنایت ہے جو اپنے مخصوص و برگزیدہ بندوں کو عطا کی جاتی ہے۔ لیکن ہر شخص بھی ہدایت کا حقدار ہے اور ہر شخص کو رحمت الٰہی سے یہ نعمت ملی ہے۔ وہ ہے اس کے سوچنے کا مادہ، اس کا تدبر، تفکر اور خودی۔ اقبال کا کہنا ہے "خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے۔ خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے"۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوگا جب کہ احکام الٰہی کی اطاعت کرتے کرتے انسانی دماغ رحمت باب کائنات پر، تر آئے گا۔ بتدریج ترقی کرنے کا مادہ صرف انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ قدرت نے گلاب کے مختلف قسم کے پودوں میں مخصوص رنگ کے پھول کھلنے کی تقدیر یا فطرت تجویز کی تھی، لیکن انسانی دماغ نے اس تقدیر کو بدل کر ایک ہی پودے میں کئی رنگ کے پھول کھلانے کی قوت پیدا کر لی۔ انسانی سوچ نے دل کے بجھتے ہوئے چراغ کو نوک نشتر سے دوبارہ اجاگر کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی۔ پرندوں کی طرح ہوا میں اُڑنا، مچھلی کی طرح سمندر میں تیرنا، تنکے کو توڑ کر بجلی کی طاقت پیدا کرنا، سب کچھ انسانی دماغ کی پرواز ہے جو اللہ کی دی ہوئی "ہدایت" صفات کا طفیل ہے۔

یہ ہدایت خاص شخصیتوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر شخص میں پائی جاتی ہے، جو اپنے شعور، تحقیق، تفتیش کے ذریعے قدرت کے راز اور زندگی کے ساز کو سمجھنے پر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

"یہی ہے چراغ منزل قائم ہے منزل مسلمان کی جس منزل کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے"

جو موسیٰ، زید، عمر، بکر بھی ہو سکتا ہے، شام، راؤ، گک اور ہیری بھی ہو سکتا ہے اور رام، کشن اور ہرنٹی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کسی خاص شخصیت کی ملکیت نہیں۔ جس میں اجاگر ہو سکے پانکپن ہے۔ یہ اتفاقاً دیگر انسانی مقدر اصولوں کی بالا استدلال پر مبنی ہے اور اس کے پیچھے انسانی شعور مقدر کے تانے کو بدل سکتا ہے، جیسا کہ بچے ربڑ کے ٹکڑے کو توڑ موڑ کر کبھی کشتی کی شکل، کبھی دوات کی شکل، کبھی گیند کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تقدیر کا فیصلہ ہے کہ مجرم سیفی کی سزا مرگ مفاجات ہو، لیکن جب تفتیش اتنی بڑھی ہے کہ عزرائیل کا حکم ٹلا نہیں چلتا۔ فطرت کا قانون ہے کہ بدی کا نتیجہ برا ہو، لیکن ہدایت کا احسان ہے کہ غفور الرحیم ہماری خطائیں معاف کر دیتا ہے اور ہماری نافرمانی کے باوجود ہمیں روزی عطا کرتا ہے۔ یہ عنایت صرف انسان کے لیے مخصوص ہے۔

رحمت ذاتِ الٰہی کی دوسری اہم صفت ہے۔ مالک کا رحم و کرم ساری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ یہ رحم کا احسان ہے کہ ماں کے دل میں مالک نے اتنی محبت ڈال دی کہ وہ سخت سے سخت تکلیف برداشت کر لے گی، مگر اپنے لال کو دکھ آنے نہ دے گی۔ یہ صرف انسانی ماں کی خصوصیت نہیں، چرند، پرند، حیوانات، کیڑے مکوڑے، ہر جاندار میں یہ محبت ودیعت کر دی گئی ہے کہ اپنی نسل کی ترویج کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار ہے۔ قدرت کا منشا ہے کہ اس کی صفات کا اس کائنات میں اظہار ہو۔ اگر ہدایت ارتقا کے لیے مخصوص ہے۔

تو رحمت اس میں روح پھونکنے کے مترادف ہے۔ گویا جسم میں جان ڈالی جا رہی ہے۔ انسان کو جسم بھی چاہیے اور جان بھی۔ جان چلی جائے تو جسم بیکار ہے اور جسم نہ ہو تو جان بیکار۔ ہدایت اور رحمت کا بھی یہی رشتہ ہے۔ مالک اپنی قدرت سے ہر چیز پیدا کر دیتا ہے اور اپنے رحم سے اس کا مقصد معین کر دیتا ہے۔ رحم میں خوبیوں کا ذخیرہ بھرا ہوا موجود ہے، خالق و مخلوق کا رشتہ رحم سے منسلک ہے۔ مالک ہم پر رحم کرتا ہے اور یہ امید رکھتا ہے کہ انسان اس رحم کی شمع کو ہر جگہ روشن رکھے گا۔ "درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں" حالی نے اسلامی فلسفہ کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کیا ہے "یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"

عدل: ذاتِ الٰہی کی تیسری اہم صفت ہے۔ عدل سے کائنات میں توازن برقرار

رہے گا۔ ورنہ سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ عربی زبان میں "عدل" کے معنی ہیں "نہ کم نہ زیادہ۔ بالکل اتنا جتنا چاہیے"۔ نہ مجبور بندہ نہ مختار ہے" نہ میانہ روی یا اس سزاوار ہے"۔ کسی چیز میں افراط و تفریط نقصان کا باعث بنتی ہے۔ عدل سے نیکی برقرار رہتی ہے۔ حق کی قدردانی کی جاتی ہے۔ قانون کی اطاعت کی جاتی ہے۔ شرارت و برائی کو روکا جا سکتا ہے۔ امن و امان کے لیے عدل و انصاف از بس ضروری ہے۔ انسانی روح مشہور مفکر شمس تبریز کے فلسفہ کے تحت تین اجزا کا مرکب ہے۔ نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ۔ ان تینوں کا نچوڑ انصاف ہے جو اعلیٰ ترین اوصاف میں شمار ہے۔ خواہشات خود غرضی، خود پسندی، خود فریبی اور عشرت پسندی پر انسان اس قدر مائل ہے کہ اگر انصاف کی لاٹھی سر پر سوار نہ ہو تو انسان و حیوان کی تفریق مٹ جائے گی۔ صحیفۂ پاک میں ہر جگہ سزا و جزا کا ذکر آیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ حشر میں حساب و کتاب اور جو کچھ ہوگا اور ہمارے اعمال کی تحقیق ہوگی۔ ہر نیکی کی کوشش رائیگاں جائے گی اور نہ برائی سے چھٹکارا ملے گا۔ مالک کا انصاف اٹل رہے گا۔ دنیا خیر و شر کا تجربہ گھر ہے۔ اس زندگی کے امتحان کا نتیجہ وہاں فاش ہوگا۔ اس لیے ہدایت کی گئی ہے کہ بندے حق و انصاف کے عادی بن جائیں۔

اسلام میں فقہ و فلسفہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ فقہ اسلامی امور سمجھاتا ہے اور فلسفہ کائنات کے نظام کو۔ اسلامی فلسفہ نے یونانی، ایرانی اور ہندی نظریات سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے۔ اسلامی فلسفہ نے مدینے میں ترویج نہیں پایا بلکہ دمشق، بغداد، قاہرہ، شیراز، اصفہان، بصرہ، قرطبہ، الحمرا، اور اسلامی مملکت کے کئی دیگر مقامات میں اس کی نشوونما ہوئی۔ صرف ایک صدی سال کے اندر اسلام، ہسپانیہ سے ہندوستان تک جب پھیل گیا تو مختلف نسلوں، تہذیبوں، ملکوں اور معاشروں کا اثر اسلامی عقیدوں پر ایسا پڑا کہ فلسفہ کا ایک نیا طوفان ابھرا۔ عالم اسلام کے کئی مقامات پر اس کی شورش ہونے لگی۔ تفکر و تدبر کا ایک سیلاب امنڈ آیا اور فلسفہ کے موتی رولے گئے۔ ہمارے مفکروں نے غیر اسلامی تفکر کو جانچا پرکھا، اور ان کے اچھے اصول و نظریات کو اسلامی قالب میں ڈھالا۔ انھوں نے ان خیالات کو ایسے ہی نہیں اپنایا بلکہ ان کو خوب کھنگالا، جہاں اسلامی عقیدوں سے تضاد تھا، ان کو ترک کیا، اور جہاں ان

سے مطابقت تھی، اپنایا۔ لیکن اس ڈھنگ سے کردہ گویا موددمعاملو تھا جس سے
اسلامی فلسفہ کی ایک نئی عمارت تعمیر کی گئی۔

اسلامی فلسفہ کا سلسلہ عہد امیہ سے شروع ہوتا ہے مفکروں کے ایک گروہ نے پچھلے زمانے کی بلند خیالی پر توجہ دی۔ اس گروہ نے انسان کی آزادخیالی کو جو ہدایت کے ذریعہ تقدیر میں تبدیلی چاہتی تھی۔ تسلیم نہیں کیا۔ اُن کا اصرار تھا کہ تقدیر اٹل ہے۔ اور انسان مجبور ہے۔ اس تصور کے گروہ کو حلقہ جبریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ سے امیہ خلفاء بہت خوش تھے۔ اس لیے کہ اُن کا قدرالعدلکی مرضی پر جارکتا تھا۔ وہ یوں کہنے لگے کہ اگر مالک نہ چاہتا تو انہیں خلافت ہی نہیں ملی تھی۔ اس لیے خلیفہ کی اطاعت کرو وہ یہ بھول گئے تھے کہ اسلام میں ملوکیت کو جگہ ہی نہیں بلکہ وہ جمہوری نظام تھا۔ یہ نظریہ سیاسی مصلحت کے لیے مفید تھا اس لیے اقتدار پرست جلد اس کا حامی بن گیا۔

لیکن یہ نظریہ تادیر قائم نہ رہا۔ مفکر پھر آزادخیال پر اتر آئے۔ ایک حلقہ جو تفویضی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے ذات الٰہیہ کی چند صفات پر گہری نظر ڈالنا شروع کی۔ وہ صفات تھی مالک کا رحم و کرم، طاقت و جبروت، حسن و نور، غفوری و غفاری، وغیرہ۔ یہ حلقہ صفاتیہ گروہ کے نام سے بھی جانا گیا ہے کچھ عرصہ بعد یہ حلقہ متشابہات حلقہ میں تبدیل ہوگیا جو خالق کو سمجھانے کے لیے مخلوق کی تشبیہ کا استعمال عمل میں لایا۔ مثلاً مالک کا رحم ماں کی محبت سے ستر ہزار گنا زیادہ ہے۔ نور الٰہی لاکھوں شمس و قمر سے بھی زیادہ منور ہے۔ وغیرہ۔ یہ حلقہ یونانی فلسفہ سے زیادہ متاثر تھا جس کا نتیجہ علم الکلام (SCIENCE OF REASONING) نکلا۔ اور بعد میں یہ حلقہ ایک زبردست گروہ بن گیا جس کا نام معتزلہ ہے۔ معتزلوں نے تشبیہات کو تسلیم نہیں کیا۔ ذات الٰہی کی اصلیت (ESSENCE) پر زیادہ توجہ دی۔ جسم و جان کا فرق بتایا۔ جسم ڈھانچہ ہے روح اصل چیز ہے۔ روح کی ماہیت تشبیہ سے نہیں ہوگی۔ مالک کا تصور ادنیٰ چیز سے کریں تو غلط مثال ہوگا۔ اس کی یہی لڑائی تھی کہ وحدۃ الوجود کو تخلیق کی ہر شے سے منزہ رکھا۔ ذات پاک کو صرف غور کی اصلیت میں سوچا گیا اصلیت دیکھی نہیں جاتی صرف قیاس کی جا سکتی ہے۔ اسلام میں خالق کا تصور بہت اعلا و ارفع ہے۔ اس حلقہ میں یہ بھی خیال تھا کہ انسان دیگر مخلوقات سے جدا ہے اور وہ ایک ہی نوع کے

کی زندگی ہمیشہ پسند نہیں کرتا۔ اختلاف و تبدیلی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ تغیر نئی چیز کی ابتدا ہے۔ حل سے رد عمل پیدا ہوتا ہے اور ان دونوں کے تغیر سے نئی چیز بنتی ہے۔ معتزلہ تصور کے یہاں مشہور جرمن فلسفی ہیگل کے خیالات نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی ان خیالات کے حامی ہیں۔ یہ خیالات انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ قدرت کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خالق کی صفات کی جھلک خود میں پیدا کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ تغیر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ترتیب و ترکیب سے ایجاد و اختراع کا پیچ بوتے ہیں۔ انسانی تہذیب ایسے ہی خیالات کی مرہون منت ہے۔

معتزلہ خیالات کا بانی ابو حذیفہ تھا۔ اس نے پانچ نکات پر توجہ دی۔ توحید، عدل، بشارت، امر و نہی اور گناہوں کی بازپرس اس کا خیال تھا کہ ذاتِ الٰہی کا علم عقل سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس حلقہ کا سارا دار و مدار عقل و شعور پر تھا۔ مذہبی تعلیم کا لب لباب انسان کو خیر و شر سے آگاہ کرنا ہے نیکی و خیر سے خالق کی رضا مندی حاصل کرتا ہے اور بدی سے بچتا ہے۔ نیکی سے خوشنودی ملتی ہے اور بدی سے عذاب۔ یہی مذہبی تعلیم ہے۔ اور عقل و شعور بھی یہی کہتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں مذہب و عقل کا تضاد نہیں۔ ہمارے فلسفیوں کا یہی سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ کہ انھوں نے اس تضاد کو دور کیا۔ اور مذاہب میں یہ تضاد کچھ زیادہ ہی نظر آتا ہے۔ معتزلہ ایک مذہبی یا سیاسی تحریک نہیں تھی بلکہ ایک فکری و علمی حلقہ۔ اس نے دیگر تمام فلسفی خیالات کو، چاہے اسلامی ہوں یا غیر اسلامی، رواداری سے جانچ پڑتال کی اور ان تمام تفکرات کو اپنایا۔ جو عقل و شعور سے بعید نہیں تھے۔ اس کا خیال تھا کہ سوائے ذاتِ الٰہی کے کائنات کی ہر شے میں تغیر ہے اور عقل و شعور سے کائنات کے ہر ذرے کا علم ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس نے ذروں (ATOMS)

کی ماہیت پر بھی غور کیا اور اپنا ایک نظریہ قایم کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ذرّے توڑے نہیں جا سکتے۔ لیکن یہ ہر اجزا کے جز ہیں۔ قدرتی تغیرات کسی قانون کی زد میں نہیں آتے۔ ان کے اسباب محض حادثات ہیں۔ ذروں کو توڑنے کی کوشش صرف موجودہ صدی میں کی گئی۔ اس سے پہلے معتزلہ نے جو سوچا تھا اسی کو صدیوں صحیح سمجھا گیا تھا۔

اسلامی فلسفہ پر ایک نظر (دوسری قسط)

معتزلہ گروہ نے توحید پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ ذاتِ الٰہی زمان و مکان سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ تغیر اس کی ذات میں نہیں۔ وہ ہمیشہ کاوش میں ہے کہ کچھ نہ کچھ تخلیق ہو، لیکن اس کا کمال و جمال ازل سے ابد تک یکساں ہے۔ اس کی صفات کے بھی الگ الگ درجے ہیں۔ نور، قوت، تخلیق، عرفان، روح وغیرہ ایک درجے میں آتے ہیں۔ ارادہ، سماعت، بصارت، ہدایت وغیرہ دیگر درجے میں۔ وہ علیم و حکیم بھی ہے اور سمیع و بصیر بھی۔ وہ مولیٰ بھی ہے اور ہادی بھی۔ چونکہ وہ مادی چیزوں سے منزہ ہے انسانی سماعت و بصارت سے اس کی پہچان نہ ہو سکے گی۔ صرف عرفان یعنی عقل سے اس کی صفات کی ایک ہلکی جھلک سمجھ میں آ سکے گی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی چیز عقل ہے، علم و ہنر بعد میں آئے گا۔ مال و دولت اور بھی نیچے کی چیز ہے۔ معتزلہ نے ذاتِ الٰہی کو تخلیق کی ہر شے سے الگ رکھا ہے۔

عباسی عہد میں معتزلہ حلقہ کا بڑا چرچا رہا۔ خلیفہ منصور اور مامون اس کے بہت معتقد تھے۔ مسجدوں اور مدرسوں میں اس کی تعلیم جاری تھی۔ عہد وسطیٰ میں یورپ کے مسیحی فلسفی اس نظریے سے متاثر تھے۔ معتزلہ نے عیسائی مذہب پر بھی گہری نظر ڈالی۔ تثلیث پر بحث کی۔ آدم کی لغزش سے انسانی تقدیر جو بنی اس پر روشنی ڈالی اور مسیحی عقیدے کے کئی نازک مسئلوں پر اپنا خیال ظاہر کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام صرف عقلی و شعوری تخیلات کو تسلیم کرتا ہے، اس لیے غیر عقلی عقیدوں کو ماننے سے وہ قاصر ہے۔ اس حلقہ کا اثر تمام علوم پر پڑا۔ علم طبیعیات، نجوم، ہندسہ، کیمیا، طب، منطق،

فلسفہ، نباتات، جمادات اور حیوانات، قدرت کے سبھی شعبے معتزلہ کی جانچ پڑتال کی زد میں آ ئے۔ اس نے کہا کہ تخلیق کے سب سے نیچے زینہ پر معدنیات ہیں، اس کے اوپر نباتات، اور اس کے اوپر حیوانات اور سب سے اعلیٰ مقام ہے انسان۔ انسان میں بھی سب سے نیچے کا زینہ جسم ہے اور سب سے اونچا روح ہے۔ انسان سے بالاتر ملائکہ ہیں اور ساری خلقت کا خالق عرش بریں پر ہے۔ لیکن ادنا سے اعلا تک ایک رشتہ ہے جس کی پہچان فلسفہ کا کام ہے۔ انسانی روح، مادی تجربے سے نکل کر حقیقت میں ختم ہونے کی ہوس رکھتی ہے اور اسلام ایسی پرواز کا حامی ہے "موت سے وحشت بشر کا ایک خیال خام ہے اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے"۔ اس آرام کو حاصل کرنے کے لیے اس دنیا میں نیکی کمانا ہوگا۔ یعنی اللہ کی خوشنودی اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ ہم اس کے سارے احکامات کو جان و دل سے قبول کریں گے اور عمل میں لگے رہیں گے۔

کچھ عرصے کے بعد معتزلہ نظریہ اپنا اثر کھو بیٹھا۔ پھر معتقدین ابھر آئے۔ صوفیانہ رنگ سے عقلی و شعوری ڈھانچہ کچھ اور ہی شکل میں بدل گیا۔ عشریہ حلقے نے زور پکڑا۔ ذات ونفا الٰہی کی مزید تفتیش شروع ہوئی۔ الاشعری پہلے معتزلہ تھے جو بعد میں ایک نئے حلقے کے بانی بنے۔ انھوں نے قرآن اور حدیث کی نئی تشریح کی۔ اور پھر نئی تدامت کی طرف لوٹ پڑے۔ انھوں نے ایمان کو عقل سے الگ رکھا۔ ایمان میں ایسے عقیدے بھی آتے ہیں جو عقل سے تو ازن نہیں رکھتے جیسے سبھی ادیان، رسول، ملائک، صحیفہ اور روز جزا پر یقین و ایمان رکھنا ہو تھا جن پر معتزلہ نے کلام نہیں اٹھائی کیوں کہ وہاں عقل و شعور کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ عشریہ حلقہ کا کہنا ہے کہ ایمان صرف سمجھ میں آنے والی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ شعور سے بالاتر منازل تک بھی پہنچا ہے۔ صفات الٰہیہ میں کوئی ایک ایسے مقامات آتے ہیں جہاں عقل کام نہیں کرتی۔

امام غزالی (١٠٥٨ - ١١١١ء) کے دور سے اسلامی فلسفہ صوفیانہ رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ خراسان میں مشہد کے قریب مقام طوس میں جو مشہور شاعر فردوسی کا بھی وطن ہے امام غزالی نے جنم لیا اور عالم اسلام پر اپنے علم کا سکہ بٹھایا۔ کہتے ہیں کہ یہ ایسے ذہین تھے کہ جب ایک لشکر ان کی ساری کتابیں اور مخطوطات نذر آتش کر رہا تھا اور ہنس رہا تھا تو یہ رونے لگے۔ وہ اور ہنسا۔ جب انھوں نے کہا کہ تو میرے سارے علمی خزانے کو تباہ کر رہا ہے اور

میں سمجھا ہوں تو تو کیوں ہنس رہا ہے؟ لٹیرے نے جواب دیا کہ تیرا خزانہ کاغذوں میں بند ہے اور تیرا دماغ ان سے خالی ہے۔ تو اس جواب کا غزالی پر ایسا اثر پڑا کہ اس دن سے وہ جو کچھ بھی پڑھتے تھے یا سیکھتے تھے انھیں وہ زبانی یاد ہو جاتا تھا۔ انھوں نے اس لٹیرے کو اپنا سب سے بڑا استاد سمجھا۔ لقمان نے بھی کہا تھا کہ انھوں نے اخلاق جاہلوں سے سیکھا تھا۔ لقمان کے اچھے اخلاق جاہلوں کے گندے اخلاق کا ردعمل ہے۔ سلجوقی وزیر نظام الملک نے جو دارالعلوم نیشاپور میں قائم کیا تھا وہاں پر امام غزالی کی تعلیم پوری ہوئی۔ واپس طوس آنے پر درس و تدریس، تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انھوں نے فقہ سے زیادہ فلسفہ پر تصنیف کی۔ فلسفہ کے بل پر ذات الٰہیہ کو سمجھنا مشکل امر ہے۔ انھوں نے تقلید کو رد کیا۔ اور صوفی مسلک کے ذریعہ حقائق کی تفتیش میں دلچسپی لی۔ بیت المقدس، اسکندریہ، دمشق، بغداد مقامات کے علمی خزانوں سے فائدہ اٹھایا اور پھر نیشاپور پہنچ کر درس و تدریس میں لگ گئے اور اپنی تصانیف کا انبار لگا دیا۔ مشکوٰۃ شریف ان کی مشہور تصنیف ہے جس میں تاریکی سے روشنی انسان کو کیسے حاصل ہو سکتی ہے، بیان کیا گیا ہے۔ حق روشنی ہے اور غیر حق تاریکی۔ حق کی تلاش مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ چند لوگوں نے قیاس آرائیوں سے، چند نے باطنی مظاہروں سے، چند اماموں کی تقلید سے اور چند جو صوفی ہیں وہ اس عقیدے سے کہ انبیاء، اولیاء، الہام کے ذریعہ حق کو تلاش کرتے ہیں۔ جہاں فلسفی عقل و شعور کے ذریعہ صرف ذات الٰہیہ کی صفات کو سمجھ سکتے ہیں وہاں صوفی مشرب اپنے عشق و وجدان کے وسیلے سے حق شناسائی حاصل کرتے ہیں۔ امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم صوفی مشرب کی مستند کتاب ہے جس میں تقلیدی و علمی دونوں طریقوں کو چھوڑ کر صوفیانہ طریقہ اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ان کا طرز خیال بو علی سینا کے فلسفے سے ملتا ہے جنھوں نے سبب الاسباب کی کھوج میں یہ پتا لگایا کہ وجود کا اصل راز ذات الٰہی کی ایک صفت ہے۔ محبت و رحم کے فلسفہ میں غزالی نے بڑی تحقیق کی ہے۔ محبت یا عشق کے پانچ زینے بتائے ہیں۔ پہلا زینہ تو خود اپنی ذات سے عشق ہے۔ ہر شخص خود کو دوسروں سے بہت بہتر سمجھتا ہے۔ ہر شخص دوسروں کی دولت اور اپنی سمجھ بوجھ کا اندازہ لگانے میں بہت فیاضی سے کام لیتا ہے۔ یہاں "انا" کا عنصر زیادہ رہتا ہے۔ انسانی ترقی کے لیے اس زینہ سے نکل کر دوسرے زینے پر جانا ہوگا۔ جہاں اس شخص سے

عشق ہوگا جو ہمارا مہربان وکرم فرما ہوگا۔ عشق کی تیسری منزل وہ ہے جہاں ہمارا عشق ان سے ہوگا جو دوسروں پر رحم وکرم کرتے ہیں یا کیے ہیں، جیسے انبیا، اولیا، صوفی، مفکر، نیک انسان یا حکمران وغیرہ۔ یہاں ذاتی فائدہ کا خیال نہیں، انسانیت ہمدردی کا سوال ہے۔ چوتھی قسم وہ ہے جہاں ہر خوبصورت شے سے عشق ہوگا۔ کسی قسم کا فائدہ خود کو یا دوسروں کو لحاظ میں نہ رکھا جائے گا بلکہ حسن بذاتہ حسن محبت کا حقدار سمجھا جائے گا۔ حسن ظاہری آنکھ سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور باطنی آنکھ سے بھی۔ ظاہری آنکھ سے حیوانات کو بھی اچھی چیز پسند ہے لیکن باطنی، داخلی وارفع حسن اسی وقت دکھائی دے گا جب کہ "جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا"۔ پانچویں قسم کا عشق صرف ذات الٰہی کے لیے مخصوص ہے، اور اس سے اونچا زینہ یا اعلا مقام کوئی نہ ہوگا۔ اس طرح فلسفۂ عشق کی امام غزالی نے کافی تشریح کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حق کی شناس صرف عشق سے ہو سکتی ہے۔ صوفیوں پر عشق سے وجدانی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ امام غزالی کا کہنا ہے کہ عقل کا مقام بہت نیچے ہے اور عشق کا بہت بلند۔ "بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی" -

اسلامی فلسفہ پھر عقل وشعور کی طرف راغب ہو گیا۔ القندی والرازی نے یونانی منطق، سیاست، اخلاقیات، ہندسہ، اور علم طبیعیات کی مدد سے خالق کی کارکردگی پر کافی تفتیش کی۔ رازی نے کہا کہ پانچ حقائق ازلی ہیں، ذات الٰہی، روح، زماں، مکاں، اور مادہ۔ تخلیق خود رَو ہے۔ روح مادے کی تلاش میں ہے، ایک عرصہ کسی قلب میں رہنے کے بعد اپنی اصلیت پر لوٹنے کی خواہاں ہو جاتی ہے۔ رازی افلاطونی فلسفہ کے بہت حامی نظر آتے ہیں۔ الفارابی ایک مشہور فلسفی ہیں جنھوں نے مذہب اور سیاست پر کافی بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول عربی مذہبی رہنما بھی تھے اور سیاسی پیشوا بھی۔ اگر انسان اس میں خوشحالی اور اس دنیا میں نجات چاہتا ہے تو احکام الٰہیہ جس کا نقشہ رسول اکرم نے پیش کیا ہے، اس پر عمل کرنا ہوگا۔ فلسفہ اس دائرہ کو چھو نہیں سکتا۔ الفارابی نے القندی والرازی سے ہٹ کر مذہبی تفکرات کو اہمیت دی۔ اسلامی سیاست کے اخلاقی عناصر بتائے۔ افلاطون کی طرح سیاسی امور کی ترتیب، رئیس کی جزئیات، اور حکمران کے ضروری صفات گنائے۔ ایک شائستہ حکومت کے قیام کے لیے حاکم و محکوم کے حقوق و

نوعیتوں کی جانچ پڑتال اسلامی نقطۂ نظر سے کی۔ ظہورِ اسلام سے پہلے سیاسی نظام کے
حالات پر روشنی ڈالی۔ اولاً اُس نظام کا تذکرہ کیا جو آسمانی ہدایت پر یقین نہ رکھتا تھا۔
دوسرا نظام وہ تھا جو ان ہدایات کو تسلیم کرتا تھا مگر اُس کی حدود سے آگے نکل گیا۔
تیسرا نظام وہ تھا جس نے احکامِ الٰہی کو عمداً مسخ کیا۔ جو تھے نظام میں عمداً نہیں سہواً غلطی ہوگئی۔
اور پانچواں نظام وہ تھا جو احکامِ الٰہی پر مکمل پابند رہا۔ یہ نظامِ رسولِ اکرم اور خلفائے
راشدہ کے دور میں ظہور پذیر ہوا۔ الفارابی کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے نفسیات،
(PSYCHOLOGY) سیاست اور تخلیقِ کائنات کے اصولوں کے پسِ منظر اسلامی
سیاست کو جانچا پرکھا اور تفصیلی بحث کی۔ اسلامی مفکروں میں الفارابی کا بہت اونچا
مقام ہے۔ یہ افلاطون و ارسطو کے فلسفے سے زیادہ مستفیض ہوا تھا۔ یہ عہدِ قدیم اور
عہدِ وسطیٰ کے درمیان رابطہ قائم رکھنے والا بڑا اور اولین محمدی فلسفی ہو گزرا ہے۔ یہ علم الکلام
(PHILOLOGY) پر بھی حاوی تھا۔ اس نے منطق کو فلسفہ کا اہم جزو قرار دیا۔ اور
مذہب و فلسفہ کے دقیق تفرقات کو دور کیا۔ اس کے نزدیک فلسفہ و مذہب میں کوئی
فرق نہیں۔ انبیاء / اولیا نے بھی اسی قانون کا پرچار کیا ہے جس کو افلاطون کے فلسفی حکمران
(PHI OSOPHER KING) نے کہا تھا۔ وہ الفارابی کی اس رائے سے متفق
نہیں تھا کہ رسولوں اور فلسفیوں کی تعلیم میں فرق ہے۔ اور الرازی سے اتفاق نہ کرتا تھا
کہ صرف فلسفہ ہی ایک ایسا واحد ذریعہ ہے جس سے علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ الفارابی
کے نزدیک مذہب بھی ضروری ذریعۂ تعلیم ہے۔ اگر ایک ہی شخص پیغمبر بھی ہو اور قانون
ساز بھی تو اس میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن ایسا ہو تو صرف خدا کے برگزیدہ بندے
جو نبی یا رسول کہلاتے ہیں انہیں کی ذات سے وابستہ ہوگا، ہر شخص سے نہیں۔
اس صورتِ حال میں فلسفہ کا یہ کام ہوگا کہ وہ الہام اور قانون دونوں کو پرکھے، جانچے،
سمجھے اور اُن کے حقائق پر روشنی ڈالے۔ جب تک فلسفی یہ کام نہ کریں گے، مذہب کے
توہمات میں پھنسنے کا امکان ہے۔ الفارابی نے سیاسی فلسفہ پر اس قدر کام کیا ہے
کہ ہمیں لاک (LOCK)، روسیو (ROUSSEAU) اور والٹیر (VOLTAIRE) کی
یاد آجاتی ہے۔

اسلامی فلسفہ کا سب سے درخشاں ستارہ بو علی سینا ہے، جس کے تفکر کی

بلند نے اسلامی فلسفہ کو شہرۂ آفاق عظمت بخشی۔ وہ ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ سے بھی متاثر تھا اور اسلامی تعلیمات کی روح سے بھی بخوبی واقف تھا۔ ان دونوں میں اس کو تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ یونانی فلسفہ کے ڈھانچے میں اس نے اسلامی روح پھونک دی۔ خالق و بندے کے درمیان جو خلیج ہے۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ فلسفہ کو قانون ربانی کا ترجمان بنایا۔ ذاتِ الٰہیہ کی تشریح میں دفتر کے دفتر کھول دیے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی شعور کے ذریعہ کائنات کا علم بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور روحانیت کا علم بھی۔ روحانیت کا ذاتِ الٰہی سے تعلق ہے، اور اس تعلق کی پرچھائیاں عقل و شعور سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ یونانی فلسفہ میں عقل و شعور سے بالاتر کوئی شئے نہیں۔ بوعلی سینا نے اس تصور کو تسلیم کرتے ہوئے یہ ترمیم کی کہ وجود کے سبب الاسباب کا پتہ بھی عقل و شعور سے کیا جا سکتا ہے۔ کائنات وجود میں نہ آتی تو ہمیں خالق کا پتہ نہ چلتا تھا۔ ہم ہی نہ ہوتے تو خالق کی تلاش کا سوال ہی نہ اٹھتا۔ اب یہ جو ساری تخلیق ہوتی تو مالک حقیقی صفات نظر آنے لگیں۔ ستاروں کی چمک، سورج کی روشنی، آسمان کی بلندیاں، سمندروں کی گہرائی، پھولوں کی مہک، چڑیوں کی چہک اور اس کائنات کے سبھی حسین مناظر اسبابات کے شاہد ہیں کہ حسن آئینۂ حق ہے۔ بوعلی سینا کا سارا فلسفہ "حسن آئینۂ حق" کے گرد گھومتا ہے۔ اس حق کی تلاش میں یہ مرد کامل ایک عظیم فلسفہ کا حامل بنا ہے۔ اس کے نزدیک ذاتِ الٰہی ایک ازلی حسن کا سرچشمہ ہے۔

ذاتِ الٰہی کی تفتیش اور تشریح میں جو نظریہ اس نے پیش کیا ہے وہ انتہائی دلچسپ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کائنات کا خالق ایک ازلی حسن ہے۔ حسن کے پیچھے ظہور کی کوشش ہے۔ اس حسن کی نمائش کی ایک ہلکی سی جھلک کائنات کی تخلیق میں نظر آتی ہے جہاں ہر شئے خوبصورتی کی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ کیا چاند، کیا ستارے، کیا پھول، کیا پتے، کیا سمندر، کیا پہاڑ، کیا حیوانات، کیا جمادات، ہر شئے اپنی جگہ کمالِ حسن کی ایک بے نظیر مثال بنی ہوئی ہے۔ یہ ظہور پذیری کا سرچشمہ اور حسن کی نمائش کا جذبۂ محبت کے منبع سے ابھرتا ہے۔ محبت خوبصورتی کی پرستش کو کہتے ہیں، اور خوبصورتی عروج کے کمال پر پہنچنے کو کہتے ہیں۔ اس دقیق فلسفہ کو سمجھنا آسان کام نہیں،

یہاں جو اہم تخیلات پیش کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ کارسازِ حقیقی ازلی حسن، ظہور یا وجود کی کشش، محبت کا کرشمہ، خوبصورتی کی پسندیدگی اور عروج و کمال کی تشریح ہے۔ شاید ایک مجازی تمثیل سے اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔ سوال یہ ہے کہ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ذاتِ الٰہی کیا ہے۔ جواب عرض ہے کہ ذاتِ الٰہی اصل اور ازلی حسن ہے جس کو کبھی زوال نہیں۔ سوال پھر موجود ہے کہ یہ حسن یا خوبصورتی کیوں عمل میں آئی۔ جواب عرض ہے کہ ہر حسن یا خوبصورتی کا تقاضہ ہے کہ وہ نمائش کی طرف مائل رہے۔ ہر اچھا گانے والا، یا بولنے والا، یا لکھنے والا یہ آرزو رکھے گا کہ اپنے فن کی اچھی نمائش ہو۔ اگر آپ کی دسترس موسیقی میں کمال رکھتی ہو تو ہمیشہ آپ کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ اپنا کمال پیش کرے اور دوسروں سے خراجِ تحسین حاصل کرے۔ نمائش کا جذبہ فطری چیز ہے جو ہمیں مالک کا عطیہ ہے۔ پھر سوال اٹھے گا کہ آخر یہ نمائش کا جذبہ کیوں؟ اس لیے کہ اس جذبے کے پیچھے عشق یا محبت کارفرما ہے۔ کائنات کا وجود حسنِ ازلی کی شکل میں عشق کے طفیل ہمیں حاصل ہوا ہے۔ اسی لیے حسن کو آئینۂ حق کہتے ہیں۔ چوتھا سوال یہ ہوگا کہ یہ حسن ہے کیا چیز؟ حسین وہ چیز ہے جو ہر لحاظ سے موزوں، مناسب، مکمل، اور انتہائی کمال کو پہنچ چکی ہو۔ اس میں رتی بھر خامی ہو تو وہ قدرتی حسن کا جواز نہ رکھے گی۔ پانچواں اور آخری سوال یہ ہوگا کہ یہ حسن و خوبصورتی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جواب عرض ہے کہ یہ سارا کھیل عشق کا ہے۔ عشق و محبت سے بالاتر کوئی شے نہیں۔ کائنات کا وجود عشق کی وجہ سے ہے۔ کائنات میں جو ربط و ضبط ہے وہ عشق کی وجہ سے ہے۔ بچہ ماں کی گود میں اس لیے پلتا ہے کہ ماں کو اپنے لال سے عشق ہے۔ یہ صرف انسانوں میں نہیں، حیوانات میں بھی ہے۔ اگر بکری کے بچے پر شیر کا حملہ ہو جائے تو عشق کی بدولت بکری میں شیر کی ہمت پیدا ہو جائے گی اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے بچے کو بچائے گی۔ حسن اور عشق کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ عشق نے کائنات کی ہر شے کو زینت بخشی ہے، ہر ذی روح میں تخلیق کا باعث بنا ہے، خالق و خلقت میں رشتہ جوڑتا ہے۔ عشق بہارِ زیست کا سامان ہے، روح کی غذا، دل کی تسکین، شاعروں کا موضوع، عابدوں کا مقصد اور صوفیوں کا مسلک ہے۔ غرض اولیاء نے عشق کی تلاش میں فلسفہ کو اتنا بلند کیا کہ حقائق کا پردہ فاش کر دیا اور عرشِ بریں

کی قوتوں پر تجزیہ کرنے کا اعجاز حاصل کر لیا۔

اسلامی فلسفہ کی کہانی از حد لمبی ہے۔ مضمون کو طوالت سے بچانے کے لیے صرف ایک اور مشہور دانش اور برگزیدہ عالم و صوفی، شہاب الدین سہروردی، کے نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم اس بحث کو ختم کر پائیں گے۔ سہروردی کا فلسفہ سورۂ نور پر مبنی ہے۔ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ انسانی دماغ جب حقائق ربانی اور روحانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو علم و حکمت و عرفان کے کئی دفتر کھل جاتے ہیں۔ بزرگ ہستی سہروردی نے بھی اس میدان میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کی کاوش "فلسفۂ نور" کے نام سے موسوم ہے۔ روشنی و تاریکی کے موضوع کو لے کر انھوں نے قدرت کی اُن بالا تر منزلوں تک پرواز کرنے کی سعی کی ہے جہاں اس عالم رنگ و بو کا خمیر بنا تھا۔ یعنی سوال وہی ہے کہ ہم اپنے مالک حقیقی کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔ وحدت الوجود کیا ہے؟ وحدت الشہود کیا ہے؟ ذاتِ الٰہی کے صفات کیا ہیں؟ وجود و ذات میں کیا فرق ہے؟ انسانی دماغ تصور کے کس آلے سے حقیقت کے راز کو معلوم کر سکتا ہے؟ جب سے انسان میں شعور آیا ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مسبب الاسباب کا سراغ لگایا جائے۔ کائنات کے اس سارے ہنگامے کا راز مقصد، حقیقت، نوعیت، اصلیت، ندرت اور فطرت دریافت کی جائے۔ ہر مذہب و ملت کے عالم و فاضل اسی تلاش میں اپنا سر کھپاتے ہیں کہ جیسے بھی ہو قدرت کے خالق کا پتہ لگایا جائے۔

سہروردی کے نزدیک باری تعالیٰ ایک نور ہی نور ہے۔ رسول اکرم نے بھی فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ستر ہزار پردوں کے اندر ڈھکا ہوا نور ہے جس کی روشنی سے ساری کائنات منور ہے۔ سہروردی کہتے ہیں کہ یہ نور ازلی اور ابدی ہے۔ یہ نور خود بخود ہے۔ یہ کسی اور شے کا کرشمہ نہیں۔ یہ نور ہر زماں و مکاں پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی نوعیت کو سمجھنا دماغ سے قاصر ہے۔ اس نور کے دو پہلو ہیں۔ ایک روحانی جو تخیل سے باہر ہے اور دوسرا اس روحانی مستور اصلیت کی ایک ہلکی سی جھلک جو سورج کی شعاعوں کی طرح انسانی عقل و شعور کے تحت سمجھ میں آسکتی ہے۔ غیر مادی یا روحانی نور کی نہ انتہا ہے اور نہ اس کا کسی شے میں ظہور۔ وہ بس نور ہی نور ہے۔ لیکن اس

کا پرتو شعور ہے۔ اس نور سے ساری ظلمت دور ہوتی ہے۔ اسی کے شعور میں
تخلیق کی قوت ہے۔ جیسے کہ پتے سورج کی روشنی میں ہماری چھوڑی ہوئی گندی
سانس کو پاک ہوا میں تبدیل کرتے ہیں جس کو انگریزی میں (PHOTOSYNTHESIS)
کہتے ہیں۔ اگر کائنات کے صرف ایک چھوٹے سے سورج کی چند شعاعوں کا کرشمہ اس
حقیر زمین پر اتنا زیادہ ہو تو زمان و مکاں کے ان گنت سورج، کرّے، اقلیم، افلاک
کو بخشنے والی روشنی کا کیا کہنا! اس نور کے شعلے سے جو ذاتِ الٰہی میں مضمر ہے، ایک رتی بھر
شرر انسان کو بخشی گئی جس کا نام عقل، شعور، فہم و ذکا ہے۔ یہ شرر اس نور الٰہی کا بہت
ہی ادنیٰ سا عکس ہو ایسے ہی جیسے کہ سمندروں کے پانی میں سے ایک بوند، یا ریگستانوں
کی ریت سے ایک ذرہ۔ اس بوند یا ذرے کا یہ کرشمہ کہ وہ آج چاند پر جا رہا ہے اور اس
کرۂ ارض پر اس قدر تماشا برپا کر رکھا ہے تو اس نور کی قدرت و قوت کا اندازہ کیجیے
جس کی روشنی سارے عالموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ نور کی قوت قدرت میں مضمر ہے
اور اس کے اجاگر کرنے میں تخلیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ
بہتے ہوئے پانی میں بجلی کی طاقت چھپی ہوئی ہے اور آج ہم اس سے الیکٹرک یا برقی
قوت پیدا کر رہے ہیں۔ پانی ہی نہیں ادنا تنکے میں بھی نور کی صفت موجود ہے جس کو
توڑ کر ایسی حرارت پیدا کی جاتی ہے جس سے ایٹمی قوت کے کرشمے آج معمولی چیزیں بن گئے
ہیں۔ یعنی اصلی یا روحانی روحِ انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہو کر کائنات کی
حقیقتوں کو جانچنے، پرکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بخش دیتی ہے۔ اس لیے اصلی
نور کی موجودگی انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے جو اسلامی فلسفہ کی روح
کو سمجھ بیٹھے تھے کس انداز کمال سے بو علی سینا اور شہاب الدین سہروردی دونوں
کے فلسفے کو صرف دو ہی لفظوں میں کس خوبی سے ادا کیا ہے شیکسپیئر کو خراج عقیدت پیش
کرتے ہوئے فلسفے کے سمندروں کو ایک بوند میں بند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں "حسن آئینہ
حق و دل آئینہ حسن"۔ دل انسان کو ترا حسن کلام آئینہ ہے "حسن آئینہ حق" اگر بو علی سینا
کا تصور تھا تو "دل آئینہ حسن" سہروردی کا تخیل ہے۔ نور دل کی ظلمت کو دور کرتا ہے اور
آئینہ اسی وقت کام آتا ہے جب کہ روشنی ہو، تاریکی میں نہیں۔ دل، آئینہ اور حسن صرف
تین لفظوں میں اتنے معنی بھرے ہوئے ہیں کہ دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔

فلسفہ نور پر سہروردی نے بڑی گہری تحقیق کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نور انسانی روح
میں تجلی ہے۔ انسانی روح کے پانچ خارجی اور پانچ داخلی مدارج ہیں۔ خارجی مدارج
میں مشاہدہ (SENSORY SPIRIT) شامل ہے جس سے سماعت، بصارت،
حرکت، احساس اور سونگھنے کی قوت ہمیں ملی ہے۔ یعنی ہمارے ہاتھ، کان، آنکھ، ناک
اور دل قدرت کی روشنی میں کام کر سکتے ہیں، اندھیرے میں نہیں۔ خارجی عضو سے
جس طرح ہماری نشوونما ہوتی ہے اسی طرح باطنی یا داخلی قوتوں سے بھی ہم ہمیشہ مستفیض
ہوتے رہتے ہیں۔ یہ داخلی قوتیں ہیں۔ تحقیق کا شوق، جاننے کے لیے تجلی کا آلہ،
فراست و ذہانت سے تجزیہ کرنے کا مادہ۔ مشاہدے و تجربات سے حاصل کیے
ہوئے ذخیرے کو اصولوں میں ڈھالنے کی صلاحیت اور سب سے آخر میں روحانی
بصیرت سے غیب کا علم۔ پانچویں صلاحیت جو الہام سے ملتی ہے صرف خدا کے
برگزیدہ بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں ہر شخص کا دخل نہیں۔ ہمارے صحیفۂ
پاک میں سورۂ نور میں ان پانچ مدارج کا ذکر کیا ہے اور اس کے بل بوتے پر ہی اس مسلک
کے سارے فلسفے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ اگر آپ کو
اس بات کی خواہش ہو کہ معلوم کریں کہ رب العالمین یعنی باری تعالیٰ کیا ہے تو یوں سمجھیے کہ
آپ کے گھر میں ایک محراب ہے، اس محراب میں ایک چراغ روشن ہے، اس چراغ میں
شیشہ لگا ہے، اس شیشے کی وجہ سے چراغ کی روشنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس
چراغ کو روشن کرنے کے لیے زیتون کا تیل استعمال کیا گیا ہے اور یہ تیل درخت
کا عطیہ ہے۔ یہاں تمثیل کے لیے پھر پانچ نکات لائے گئے ہیں۔ محراب، چراغ،
شیشہ، تیل اور تیل کا ظرف۔ خارجی تمثیل سے باطنی اصلیت مقصود ہے۔ خارجی
پانچ چیزیں جو بیان کی گئی ہیں سمجھ میں آ جاتی ہیں، لیکن ان پانچ کے نتیجے سے چراغ
میں روشنی پیدا ہوگی، وہ روشنی یا نور کیا ہے۔ سمجھنا مشکل ہے۔ آج کل کے
زمانے میں آپ کو چراغ کی مثال اچھی نہ لگے تو بجلی کی برقی قوت سے جو روشنی
آپ کو نظر آئے گی اس کے لیے بھی وہی پانچ وسیلے ضروری ہیں۔ آپ کے الیکٹرک
لیمپ کو میز پر یا چھت سے کہیں نہ کہیں لگانا ہوگا۔ گلاس لیمپ کے اندر بتی یا
— تار (FILAMENT) رہنا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد شیشے کی بھی ضرورت ہوگی۔

لیمپ، شیشہ جوتی اور شیشہ کے علاوہ بجلی کی قوت یعنی کرنٹ بھی چاہیے۔ آپ ان تینوں عناصر کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ نور یا بجلی قوت یا کرنٹ کیا ہے، کہاں سے آیا، کس نے بخشا، وغیرہ وغیرہ تجزیہ پر آپ اتر آئیں تو آپ کا دماغ چکرا جائے گا۔ سورۂ نور کی تشریح علامہ عبداللہ یوسف علی کے قلم سے جو حضرت امام غزالی کو مستند سمجھ کر بیان کی ہے از حد پُر مغز ہے۔ علامہ یوسف علی کا ترجمان القرآن میں ضمیمہ آٹھ APPENDIX VIII دیکھیے جہاں یہ درج ہے کہ محراب سے تشبیہ انسان کے قویٰ و شعور کی قوت سے شیشہ سے تخیل کی بتی سے ذہانت و فراست کی تیل سے تفصیلات کو چھوڑ کر اصول تراشنے کی قوت سے، اور خود روشنی خدا کی قدرت کے کرشمے سے تشبیہات اور نگینے ہیں۔ چراغ یا لیمپ کو انبیاء یا رسولوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کے اندر کی روشنی کو باری تعالیٰ کے نور سے۔ نورِ الٰہی جو انسان کے دل میں بستا ہے، وہ تین عناصر سے مرکب ہے۔ انسانی شعور، فہم و ذکا، ہمت و قوت شوق و عمل، عشق و محبت اور ارادہ۔ ان تینوں کے ملاپ سے عدل و انصاف کا جوہر پیدا ہوتا ہے جو اعلیٰ ترین خوبیاں اور نیکیوں میں شمار ہوتا ہے۔ انسان کا روحانی لقب، یعنی شمع ہدایت سے دل کو منور کرتا ہے۔ جب نور کا یہ شعلہ دل میں بھڑک اٹھتا ہے تو انسان بلا تمیز نور عالم کی توجہ کی طرف رجوع ہو جاتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا لب لباب ہے۔ پاک روح جسم خاکی سے پرواز کر کے نورِ الٰہی سے جا ملتی ہے۔ گندی روح جسد خاکی سے نکل کر دوزخ کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ جس نے روح کو گندگی سے پاک رکھا وہ نورِ الٰہی کا مستحق بنا اور جس نے قدرت کی عطا کردہ پاک روح کو گندہ بنا دیا وہ سزا کا مستحق پایا گیا۔ غرض روشنی و تاریکی، نور و ظلمت کے مفہوم کو سہروردی نے نیا روپ اور صوفی یا فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا ہے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ علم کی روح ہے اور جب تک علم میں ترقی ہوتی رہے گی فلسفہ کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جائے گا۔ فلسفہ کا تعلق تہذیب و تمدن سے بھی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اسلامی تہذیب و تمدن آسمانِ عروج پر تھی تو فلسفہ کی ترویج بھی اسی مناسبت سے عمیق و وسیع ہوتی گئی تھی۔ جب اسلامی تہذیب میں زوال آیا تو اسلامی فلسفہ کا چراغ بھی بھڑک کر گل ہو گیا۔ تیرھویں چودھویں صدی

طوسی کے بعد ایک بھی لفتدری، الفارابی، الغزالی، ابن العربی، بوعلی سینا، سہروردی جیسا پیدا نہ ہوا، حالانکہ اس عہد کے بعد اب تک یورپ میں ایسے ایسے جیّد فلسفی پیدا ہوئے جو علم و فضل کے درخشاں ستارے بنے۔ ایک چھوٹے سے جرمنی میں کئی گوئٹے شوپنہار، سپینوزا، ہیگل، مارکس اور سپینگلر پیدا ہوئے۔ لیکن بدقسمت عالم اسلام میں ایک بھی غزالی پیدا نہ ہوا۔ بجز ہندوستان کی دھرتی کے جہاں صرف ایک اقبال اسلام کی آبرو برقرار رکھنے کی خاطر میدان فلسفہ میں سرگرم عمل رہا۔ اس کے عشق، خودی، عمل اور یقین کے پیغام نے ایک مردہ قوم میں کچھ تھوڑی سی جان پھر سے بھر دی۔ وہ ستارہ غروب ہونے کے بعد کہیں سے اور امید نظر نہیں آتی۔ کاش کہ اسلام کا اقبال پھر بلند ہو۔

تصوّف کی جھلکیاں

تصوف کا تعلق دل کی نفاست سے ہے۔ دل بارگاہِ جلیل اکبراست ہے کے مفہوم کو سمجھ لیں تو تصوف کے معنی بھی سمجھ میں آجائیں گے۔ دل اللہ کا گھر ہے یہ کائنات کی کل حقیقتوں کی عکاسی کر سکتا ہے۔ بشر کو خالق کی قدرت سے ملانے کا واحد وسیلہ دل ہے جس انگیز حق ہے اور دل آئینۂ حسن۔ جب دل صاف ہو اور ہر قسم کی کثافت سے پاک ہو تو قدرت کی تجلی اس میں جھلکتی ہے۔ اس قرب سے وجدانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے صوفیائے کرام بے قابو ہو جاتے تھے۔ تصوف روحانی تعلیم کی اس منزل کو کہتے ہیں جہاں اسرارِ خداوندی کے پرتو نظر آتے ہیں۔ علم و عرفان کے دروازے کھل جاتے ہیں جہاں حقیقت جلوہ نما ہے۔ وہ مقام اور بلندی نصیب ہوگی جو قربِ خداوندی ہے۔ صحیفۂ پاک میں بشارت دی گئی ہے کہ متقیوں کا فوزِ عظیم قربِ الٰہی ہے۔

تصوف دین کا وہ جز ہے جہاں روحانی احساسات پیدا ہوتے ہیں خدا بینی اور خود بینی کی کوشش انتہا کو پہنچ کر انسانی وجود کا اصل مقصد ہاتھ آجاتا ہے۔ وہ مقصد صدق و صفا، صبر و استقلال، راز و نیاز، ذکر و فکر، زہد و تقویٰ، امید و خوف کے ذریعے رب العالمین کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس کے لیے علم و عمل چاہیے وہ علم نہیں جو آنکھ کی بصارت، کان کی سماعت، زبان کی طلاقت یا ہاتھ کی حرکت سے ہمیں ہاتھ آتا ہے بلکہ وہ علم جو مالک کی محبت کو دماغ میں سمو کر خونِ جگر سے چشمِ دل میں نظر پیدا کرتا ہے۔ اس علم کو علمِ عرفان کہتے ہیں۔ خدا کے بہت ہی برگزیدہ بندے

جیسے انبیاء اس علم کو الہام کے ذریعہ پاتے تھے ۔ ان کے بعد اولیا ئے کرام ایک خاص
مسلک سے حاصل کرتے تھے جس سے تصوف کی تکنیک بن گئی ہے۔

اس تکنیک کے چار مدارج ہیں شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت۔ شریعت
کا پہلا مقام ہے جہاں انسان خود کو مکمل طور پر احکام الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہاں
اسلام کے بتائے ہوئے سبھی فرائض شامل ہیں۔ صوم و صلوٰۃ، اخلاق، ہدایات اور
سبھی کچھ۔ شریعت دین اسلام کا باضابطہ نظام حیات یا دستور العمل ہے۔ جس پہ چلنے سے
وہ مسلمان کہلانے کا مستحق ہوگا۔ یہاں اطاعت والدین فرض ہے۔ یہاں خود غرضی، جہالت،
حسد، بغض، غیبت، غصہ، کینہ کپٹ، سبھی نفسی شرارتوں کو دھو کر دل کو پاک صاف بنانا
ہوگا۔ نفسانی اور بخلی خواہشات کو دبا کر ہی دل کا آئینہ پاک ہوگا جس میں آئندہ چل کر
نور الٰہی جھلکے گا۔ چونکہ دل کو مالک حقیقی کا پائے تخت بنانا مقصود ہے اس لئے ضروری
ہے کہ وہاں کسی قسم کی گندگی نہ ہو۔ یہ قوم کی خدمت کا مقام ہے جو شریعت کے تحت نے کی
گئی ہے۔

تصوف کی دوسری منزل طریقت ہے۔ ہر چیز کو حاصل کرنے کا ایک خاص طور طریقہ
ہوتا ہے۔ جب تک صحیح راستہ اختیار نہ کیا جائے منزل مقصود کو پانا دشوار ہے۔ تصوف
کی منزل پہ چلنے والے کو سالک کہتے ہیں اور جب یہ سالک شریعت سے طریقت کے میدان
میں آئے گا تو اس کو سات مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ پہلا توبہ کا دروازہ ہے۔ جب
تک صدق دل سے آلائشوں سے پاک ہونے کی نیت نہ کر لی جائے اور پچھلی لغزشوں،
کوتاہیوں اور گناہوں سے توبہ نہ کر لی جائے سالک آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ پچھلے
گناہوں کی توبہ، کبیرہ کی بھی ضمانت ہے کہ وہ دانستہ یا غیر دانستہ ہر لحاظ سے اور ہمیشہ
کے لیے برائی کو خیرباد کہہ دے گا۔ توبہ کے بعد دوسرا مرحلہ ورع کا ہے جہاں ہر گندگی
چیز سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اگر طبیعت ہمیشہ بھلائی کی طرف راغب ہو اور برائی
سے دور رہے گی تو سالک کے سفر میں مدد ملے گی۔ اس لیے وہ ہمیشہ ورع کو اپنا شعار بنائے گا۔
تیسرا مرحلہ زہد ہے۔ عبادات میں خشوع و خضوع سے حاصل ہوگا۔ دل کی گہرائیوں
سے الفت ربانی پیدا کرنا زہد ہے۔ دل و دماغ خالق کے ذکر و ثنا میں ایسا کھپ جاتے
ہیں کہ سالک کو ہوش و حواس نہیں رہتا۔ چوتھا مرحلہ فقر ہے۔ فقیر وہ ہے جو فاقہ کرے،

قناعت کرے۔ ریاضت کرے۔ فقیر غریب نہیں ہوتا۔ مال رکھتے ہوئے بھی صفاق
اس سے کرے گا تاکہ نفس کی شرارت ٹوٹے۔ اسی لیے اسلام میں رمضان کے روزے
فرض قرار دیے گئے ہیں۔ جب تک اللہ کی راہ میں سالک کچھ نہ کچھ قربانی نہ کرے قربت کی
منزل قریب نہ آئے گی۔ سب سے بڑی قربانی نفس امارہ کو زیر دست کرنا ہے۔ یہ پانچواں
مرحلہ صبر ہے۔ صبر کا بہت اعلیٰ مقام ہے۔ آیت کریمہ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ
اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر سے ہر چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ قرب
الٰہی آسان نہیں۔ اس کے لیے صبر ایوب چاہیے اور گریہ یعقوب۔ صبر میں استقلال تحمل
بھی چاہیے۔ تحمل نہ ہو تو صبر تو ٹوٹتے وقت ہوگا۔ چھٹا مرحلہ توکل ہے۔ یہ صبر سے ہی
لگا ہوا اللہ پر بھروسا اور یقین ہے جس کے تحت ہر حال میں مالک سے دل لگائے رکھنا ہوگا۔
توکل انسان کی مجبوری کا اعتراف ہے۔ اللہ کی مرضی کا یقین۔ ساتواں مرحلہ ہے رضا۔
سالک ہمیشہ راضی برضا رہے گا۔ طریقت کے ان ساتوں مراحل کو جب وہ اپنا کر آگے بڑھے
گا تو وہ تصوف کی دوسری منزل پر پہنچ جائے گا۔

تصوف کی تیسری منزل معرفت ہے۔ یہ علم کا میدان ہے۔ علم بھی ایسا ویسا نہیں،
عرفان کا جہاں چاروں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔
جس کو سمجھنے کے لیے ظاہری عقل کام نہ دے گی۔ اس کا احاطہ از حد محدود ہے۔ عقل
رموز باطن کا سراغ لگاتا ہے جو عقل و شعور سے ماوراء بالاتر ہے۔ یہ وہ وادی ہے جہاں وہ مقامات
طے کرتا ہے جو ظاہری علم برسوں میں بھی طے کر نہ سکے گا۔ یہاں منطق سے کام نہ چلے گا۔
یہاں علم الیقین سے نکل کر عین الیقین ہوتے ہوئے حق الیقین تک پہنچنا ہوگا۔ یہاں
نفس امارہ کو مار کر، نفس لوامہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے نفس مطمئنہ کو پانا ہوگا۔
یہاں خود بینی کو پیچھے کر کے جہاں بینی کو عبور کرتے ہوئے خدا بینی کے دائرے میں
آنا ہوگا۔ یہاں نور کی اصلیت کو سمجھنا ہوگا۔ ربوبیت کے معنی تلاش کیے جائیں گے
عبد و معبود کے تعلق کو جانچنا ہوگا۔ یہاں ایک نہیں دس مرحلے طے کرنا ہوگا۔
سب سے پہلا مراقبہ ہے۔ سالک کے ذکر میں ایسا دل لگا کر بیٹھ جاتا جہاں دل و
دماغ پر کسی اور چیز کا دخل نہ ہو۔ جیسا کہ موتی کا ایک متلاشی سمندر کی تہہ کو پہنچ
جاتا ہے اسی طرح سالک ذکر الٰہی میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اسے کسی اور چیز کی خبر نہیں

رہتی۔ انسان کے سارے حواس حتیٰ کہ سانس بھی صرف "اللہ ھو" کا ورد کرنے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک دن کا نہیں کئی دن یا مہینے یا برس مسلسل رہا۔ محبت کا سلسلہ ہوگا۔ دوسرا مرحلہ محبت کا ہے۔ اس کی توضیح آسان نہیں۔ محبت حسن حق کی بھوک ہے۔ محبت تختی ہے توریت کی۔ محبت کتاب ہے انجیل کی۔ محبت صحیفہ ہے قرآن کا۔ محبت خاصیت ہے خالق کی۔ محبت کنجی ہے قرب الٰہی کی۔ محبت جزو ہے تخلیق کی۔ محبت نہ ہو تو انسان کیا حیوان بھی اس کرۂ ارض پر نہ وجود میں آتے اور نہ پنپتے۔ محبت زندگی کا سرمایہ ہے۔ ہمارے اخلاق، انسانیت، ادب اور شاعری کی روح رواں ہے۔ مالک کا رحم و کرم، فضل و احسان، سب کچھ محبت سے وابستہ ہے جہاں محبت ہے وہاں خدا ہے۔ اسی لیے عشق الٰہی عرفان کا سرچشمہ ہے۔ سالک اسی کے ذریعے زینہ بہ زینہ اعلا مدارج طے کرتا جاتا ہے۔ تیسرا مرحلہ خوف ہے۔ خوف الٰہی نہ ہو تو نفسانی خواہشات اصل مقصد سے دور کر دیتی ہیں۔ خوف راستہ بھٹکنے نہیں دیتا۔ فکر صحیح کی گردش سے جو خطرہ لاحق ہوگا اس سے روکے گا۔ چوتھا مرحلہ امید ہے۔ بشر کی زندگی امید سے ہی وابستہ ہے۔ دل میں خوف خدا کے ساتھ یاد الٰہی و عشق باری تعالیٰ ہو تو امید کی کرن پھوٹ نکلتی ہے اور سالک اپنی منزل پر گامزن رہتا ہے۔ پانچواں مرحلہ شوق کا ہے جو مقناطیس کی طرح حق کی جانب کھینچے لیے جاتا ہے۔ شوق عشق کا تازیانہ ہے جو مشکل سے مشکل امر کو بھی حل کرنے کی استطاعت رکھتا ہے جب تک انتہائی شوق نہ ہو معرفت کے موتی نہیں ملتے۔ عرفان تو درکنار زندگی کے کسی بھی شعبہ میں شوق کے بنا کچھ بھی پانا دشوار ہے۔ چھٹا مرحلہ قرب ہے۔ سالک اپنی مسافت طے کرتا جائے تو قرب الٰہی نزدیک ہوتا چلا جائے گا۔ امید و شوق کے بل بوتے پر عشق و محبت کا سہارا لے کر سالک قرب کی منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کو "انس" کا ساتواں مقام نظر آتا ہے۔ انس، الفت، محبت، عشق، جیسا ہی وہ پاک جذبہ ہے جس سے ساری کثافت دور ہوتی ہے اور روحانی عمل کی چنگاری شعلہ بننے کے لیے تڑپ اٹھتی ہے۔ آٹھواں مقام "اطمینان" کا ہے۔ سالک مراقبے سے نکل کر کافی تگ و دو کے بعد انس کے مقام پر جب پہنچتا ہے تو تھکا ماندہ آٹھویں منزل پر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ ذہن انسانی کے لیے اطمینان ایک نعمت غیر مترقبہ ہے

یہ ایسی ہی کیفیت ہے جیسی کہ ایک ہونہار طالب علم کو امتحان دے چکنے کے بعد نتیجہ فرسٹ نمبر ملنے کی امید ہو۔ تویں منزل مشاہدہ کی ہے۔ گویا یہ کولمبس ہے جو مہینوں کی تلاش کے بعد منزل مقصود کے ساحل کا پتہ پا لیتا ہے۔ قرب الٰہی کا مشاہدہ دور سے ہی سہی ایسا روح افزا ہوتا کہ سالک کی ساری کاوش بارآور ہوگی۔ دسویں اور آخری منزل یقین کی ہے۔ یہاں کامیابی کا دروازہ ہے۔ قطعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ دعا مقبول ہوگئی۔ مشاہدے کی جو جھلک دور سے نظر آئی ساحل کے قریب پہنچتے پہنچتے یقین آگیا کہ وہ ٹھیک منزل مقصود ہی کا نظارہ تھا۔

ان تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد معرفت کے سرچشمے پھوٹ نکلیں گے۔ ایسے مقام کو پہنچ پہنچتے مادی اثرات کا دباؤ بالکل کم اور روحانی اثرات کا احساس قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ عجیب کیفیتیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ذات الٰہی کا شوق اس قدر بڑھتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز نظر میں جچتی نہیں۔ ابوالحسن خرقانی، جو ایک مشہور صوفی تھے کہنے لگے "میں یہ نہیں کہتا کہ جنت دوزخ کا وجود ہے یا نہیں، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ وہ میرے لیے کچھ نہیں، کیونکہ رب العزت نے ان دونوں کو بنایا ہے، اور میں ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں اس کی تخلیق کی چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں" مطلب یہ کہ دنیا کی ہر شے جو پیدا کی گئی ہے اس کو زوال ہے۔ صوفی کو ایسی ناپائیدار چیزوں سے رغبت نہیں۔ ذات الٰہی ہی ایک لازوال، ازل سے ابد تک رہنے والی ذات پاک ہے لہٰذا صوفی صرف اسی سے دل لگائے بیٹھا ہے۔ وہ نیکی جنت کی ہوس پر اختیار نہیں کرتا اور دوزخ کی آگ سے ڈر کر برائی نہیں کرتا۔ صرف عشق الٰہی سے اسے سروکار ہے اور باقی سب کچھ اس کی نظر میں ہیچ ہے۔ معرفت میں پہنچ کر صوفی کی کائنات بدل جاتی ہے۔

چوتھی اور آخری منزل حقیقت کی ہے۔ یہی منزل مقصود ہے۔ یہی وہ اعلیٰ و ارفع مقام ہے جہاں جلوۂ خداوندی کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔ صوفی کی روح آئینہ حق میں جھلکتی ہے۔ کائنات کا راز کھلتا ہے۔ حقیقتوں کا پردہ فاش ہوتا ہے۔ خالق و بندے کا ملاپ ہوتا ہے۔ روحانیت کی معراج حاصل ہوتی ہے۔ تخلیق کا مدعا پورا ہوتا ہے، نور میں نور جا بستا ہے۔ اسی مقام کو پہنچ کر منصور نے انا الحق کہا تھا۔ یہی فنا کا مقام

ہے۔ یہاں مادیت کا آخری قطرہ روحانیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جسد خاکی سے نکل کر صوفی کی روح حقیقت میں گم ہو جاتی ہے۔ یہاں وحدت میں شرکت ہے۔ یہ کمال کا درجہ ہے صوفی انسان کامل بن جاتا ہے جو تکمیل کا مدعا ہے۔ مذہب، دین، اصول وغیرہ کا اس مقام میں دخل نہیں۔ منصور پکار اٹھتا ہے "میں حق ہوں"۔ میں وہ ہوں جس سے مجھے عشق ہے، اور جس سے مجھے عشق ہے وہ میں ہوں۔ میں وہ بن جاتا ہوں جو میں چاہتا ہوں، اور جو میں چاہتا ہوں وہ میرا بن جاتا ہے۔ ہم ایک جسد میں دو روحیں ہیں، مجھے دیکھنا اسے دیکھنا ہے اور اسے دیکھنا مجھے دیکھنا ہے۔ منصور کے اعلان سے یہ پتہ چلا کہ حق کا اظہار بندے کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اعلا و ارفع مقام پر ذات الٰہی کی صفات بندے میں آ سکتی ہیں۔ چنگاری شعلے کا ہی ایک حصہ ہے۔ روشنی کی کرن سورج کی صفت سے علاحدہ نہیں۔ حالی نے کمال سادگی سے قدرت کے راز کو یوں فاش کیا ہے "جانور، آدمی، فرشتہ، خدا، آدمی کی کئی ہیں قسمیں"۔ تدریج کے ان مدارج میں آپ اپنا مقام ڈھونڈ سکتے ہیں۔ چاہے کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے، چلتے، پھرتے صرف جانور رہیں یا آدمیت، انسانیت اور فرشتوں کے مقام سے گزر کر خالق کی قدرت کے دائرے میں آ جائیں یہ آپ پر منحصر ہے۔ لیکن آخری مقام آسان نہیں۔ یہاں اپنے آپ کو فنا کرنا ہوگا۔ ہر بلندی اپنا اپنا دام وصول کرتی ہے۔ ذات الٰہی کا جلوہ مقصود ہو تو اپنی جان کی بازی لگا کر خریدنا ہوگا۔

تصوف کے ان مدارج کی ایک اچھی سی تمثیل یوں ہے۔ ایک صوفی نے اپنے تین مریدوں کو ایک جگہ بٹھا کر جاتے جاتے مرید سے کہا کہ جاؤ اور ان تینوں کو ایک زور کی ضرب لگا دو۔ جب تینوں کو ضرب پڑنے لگی تو پہلے شخص نے بدلے کا جواب بدلے سے دیا۔ دوسرا شخص حرکت میں آیا، ہاتھ اٹھایا پھر بھی ضبط سے کام لیا۔ تیسرا شخص یوں خاموش رہا کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ صوفی نے سمجھایا کہ پہلا شخص ابھی شریعت کے دائرے میں ہے۔ یہ حق بجانب ہے کہ چوٹ کا بدلہ چوٹ سے لے۔ دوسرا شخص طریقت میں ہے۔ وہ ضبط نفس کی کوشش کر رہا ہے۔ چوٹ کی تکلیف سے بلبلا اٹھا، حرکت میں آیا، پھر بھی قابو میں رہا۔ طریقت کا سلوک سیکھ رہا ہے۔ تیسرا ان تمام مقامات سے گزر چکا ہے

اور حقیقت کا منتظر ہے۔ وہ اس مقام پر ہے جہاں جھوٹ کوئی چیز ہی نہیں۔ عشق الٰہی میں ایسا پھنسا ہے کہ دنیا و ما فیہا کی بھی خبر نہیں۔

تصوف کے لیے ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ یہ پیری مریدی کا سلسلہ ہے۔ مرشد کی مدد ہدایت کے بغیر مدارج طے کرنا دشوار ہے۔ مرشد یہ دیکھے گا کہ مرید میں وہ [illegible] خصوصیات ہیں یا نہیں۔ پہلی فہم و ذکا جس سے علم عرفان کا بوجھ سہنے کی سکت پیدا ہوتی ہے اور جو دین کی بنیاد ہے۔ دوسرا ذوق و ولولہ جو پرواز کا آلہ ہے۔ تیسری توکل و بھروسہ جو تصوف کا سرمایہ ہے۔ چوتھی دل تمنا و آرزو جو سالک کی ساتھی ہے۔ پانچویں علم الیقین جو میدان جنگ کا حربہ ہے۔ چھٹی صبر و استقلال جو صوفی کی پوشاک ہے۔ ساتویں تقویٰ جو مرید کا پیشہ ہے۔ آٹھویں اولوالعزمی و مستقل مزاجی جو سالک کی خوراک ہے اور نویں عبادات جو صوفی کے دل کی ٹھنڈک ہے۔ یہ نو ہدایات جو تقویٰ کی ہیں رسول اکرمؐ کی بتائی ہوئی ہیں۔

تصوف کے اعلیٰ مدارج میں اعتقاد کے ظاہری اصول کمزور نظر آتے ہیں۔ موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، رقص و سرود جائز سمجھے جاتے ہیں۔ وجد کی حالت میں بیخودی طاری ہو جاتی ہے، بھوک، پیاس اور ضروریات زندگی کا لحاظ نہیں رہتا۔ قرب الٰہی کی شدت کی تمنا حد سے تجاوز کر کے ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کے بھی پانچ درجے ہیں۔ پہلا درجہ "انا" کا ہے جہاں شخصیت کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ دوسرے درجے میں "انا" یعنی "میں" اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے جہاں سوائے شخصیت کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تیسرا درجہ اس کا ردعمل ہے اور ترک "انا" یہاں "میں نہیں ہوں" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اپنی حدود کا احساس شدت سے شروع ہو جاتا ہے۔ چوتھا درجہ اور بلندی پر لے جاتا ہے جہاں خالق کی ملوکیت ہے۔ سالک پکار اٹھتا ہے۔ صرف "تم ہو"۔ پانچواں درجہ کمال انتہا کا ہے۔ حاصل مقصود کا مقام ہے جہاں روحانی سنگم سے سیرابی ہوتی ہے۔ بندہ عالم بالا میں گھل مل جاتا ہے اور اپنی خودی کی معراج پا لیتا ہے۔ اس مقام پر وہ پکار اٹھتا ہے "میں نہیں ہوں اور تو نہیں ہے۔" میں اور تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ نا رندی سے اور رندی تمنا سے جا ملتی ہے۔ فانی کا ادنا غلام اوج ثریا پر مقیم ہو جاتا ہے۔

تصوف صرف کمال کا تخیل ہی نہیں بلکہ بعض اولیاؤں اور صوفیا نے اس کو حقیقت کا جامہ بھی پہنایا ہے۔ حضرت امام غزالی کا کہنا ہے کہ رسول اکرمؐ کی معراج بھی قرب الٰہی کی ایک کڑی تھی۔ تصوف کے میدان میں امام غزالی کی تحقیقات کافی گہری ہیں۔ شہاب الدین سہروردی، بو علی سینا، ابن العربی، اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ اور کئی مشہور صوفی بزرگان نے دین اسلام کی سچی روح کی تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ خاص کر ہندوستان میں نظام الدین اولیا، معین الدین چشتی، بابا فرید گنج شکر، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، ولادیہات قلندر اور دیگر بیسیوں صوفیائے کرام کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ ہوئی۔ یہ خیال غلط ہے کہ سلاطین کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام پھیلا۔ سلطان التمش کے زمانے میں شیخ حمید الدین ایک صوفی بزرگ تھے جو تھوڑی زمین کی کاشت سے اپنا گزارہ کرتے تھے۔ بادشاہ نے وظیفہ مقرر کرنے کی خواہش کی تو انھوں نے اس کو قبول نہ کیا۔ شیخ احمد سرہندی جو مجدد الف ثانی کے نام سے موسوم ہیں اکبر کی مذہبی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کرتے رہے۔ صوفیائے کرام کے پاس ادنیٰ اعلیٰ، ذات پات رنگ نسب کی تمیز نہیں تھی۔ وہ خدمت خلق کو اپنا شعار سمجھتے تھے، اخلاقی شخصیت کے علمبردار تھے، اور انسانیت کے پرستار تھے۔ ایک صوفی کا کہنا ہے "اگر تم ہوا میں بھی اڑ سکو تو تم مکھی ہو، اگر پانی پر چل سکو تو تم تنکا ہو، لیکن اگر کسی کا دل موہ سکو تو کچھ ہو۔" صوفی منہاج الدین سراج کے متعلق بلبن نے کہا ہے کہ سراج کو نہ بادشاہ کا خوف ہے اور نہ خدا کا۔ وہ صرف اپنے ضمیر سے ڈرتا ہے۔ ہمارے ادب کا سرمایہ تاریخ تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہماری شاعری کی جان ہے۔ حقیقی شاعری بھی عشق مجازی کے پردے میں عشق الٰہی کی ترجمان ہے۔ ہمارے تخیل کی پرواز تصوف پر ہی منحصر رہی۔ اسی سے ہمارے فلسفے نے تقویت پائی۔ وہی اخلاقیات کا منبع سمجھا گیا۔ درس و تدریس کا نصاب رہا۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد قرار دیا گیا اور زیست کا حاصل تصور کیا گیا۔

لیکن تصوف کی طرف از حد رجحان دنیاوی ترقی کے راستے میں مانع ہوا: رہبانیت، خانقاہی، پیری مریدی، بے عملی سے محبت اور دنیا سے نفرت نے عالم اسلام کو ایسے راستے پر لا کھڑا کیا جہاں سے سیاسی اقتدار، اقتصادی طاقت، علم و عمل

کی کاوش، اختراع و ایجادات کا ذوق اجتہاد و جہد کا شوق اور وہ سارے جذبے جن سے انسان خلیفۃ الارض کہلایا۔ ختم ہونا شروع ہو گئے۔ اسلام ایک میانہ روی کا مذہب تھا جہاں دین و دنیا دونوں کی بہبودی مقصود تھی لیکن جب اس دنیا کو ٹھکرا کر صرف اُس دنیا پر نظر رہی، تو اس دنیا کے مقتدر اغیار بن گئے۔ نہ حکم الٰہی یہ تھا کہ اس دنیا کو ترک کرو اور نہ سنت رسول کی یہ تعلیم تھی کہ صرف علم عرفان پر توجہ ہو۔ رسول اکرم کی تعلیمات میں دینی یعنی اخلاقی اصول کو سیاست، ریاست، تہذیب و تمدن غرض زندگی کے ہر شعبے میں برابر دخل تھا۔ اگر ان تعلیمات کو علامہ اقبال کے الفاظ میں کہا جائے تو یوں ہوگا: "ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات" جب احتساب کائنات کی لذت کم ہو گئی تو مزاج خانقاہی پختہ ہونے لگا۔ جب تک مسلمان اپنی نظر ہر دم بلندیوں پہ جمائے رکھے ترقی کرتے گئے۔ "ورا ہے یہ چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی۔ ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے" جب فکر و ذکر خانقاہی میں تقریب پر یہ رہی تو شمشیر و سنان ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ طاؤس و رباب سے بھی دلچسپی ہونے لگی۔ صوفی و سالک رقص و سرود کو بھی پسند کرنے لگے۔ ماضی کا نقشہ بدل گیا "مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے۔ وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی" اسلامی تعلیمات کو روح کی تفریح سمجھا گیا تو عقل و شعور، جد و جہد، محنت و کاوش، تحقیق و تفتیش، علم و حکمت، ایجادات و اختراعات، سائنس و ٹکنالوجی، سب ہاتھ سے نکل گئے۔ اغیار نے ان کو اپنایا اور وہ چاند پر پہنچ گئے۔ تصوف میں قرب الٰہی پانے والے خانقاہ سے باہر نہ نکلے۔ جب کوئی چیز حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو وہ اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے یہی حال خانقاہوں کو آباد کرنے والوں کا ہوا کہ روحانی معراج کی خواہش میں نانِ شعیر بھی نہ پا سکے۔ یہ تصوف کی غلطی نہیں تھی بلکہ اس کو سمجھنے والوں کی تھی۔ علامہ اقبال نے صحیح فرمایا تھا۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دین ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

اخلاق کا سدھار

مسلمانوں کے تہواروں کے جہاں کئی مقاصد ہیں وہاں اخلاق کا سدھار بھی ایک اہم مقصد ہے۔ ہمارے کردار ہماری قسمت کا فیصلہ سناتے ہیں۔ کامیاب زندگی مال و دولت سے خریدی نہیں جا سکتی۔ علم و ہنر سے بھی نہیں حکومت و اقتدار سے بھی نہیں صرف اچھے اخلاق سے سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اچھے اخلاق ہوں اعمال نیک ہوں انسانیت پاک ہو، حوصلے بلند ہوں تو ہمارے سخت سے سخت مخالفین بھی ہماری عزت کریں گے۔ ہمارے عادت و اطوار طور طریقہ، سوچ بچار کا ڈھنگ، میل ملاپ کا رنگ اور برتاؤ کا سلیقہ ایسا ہو کہ اگر ہم دوسروں کو خوش نہیں کر سکتے تو کم از کم انہیں ناخوش بھی نہ کریں۔ رسول اکرم سے پوچھا گیا کہ اسلام کیا ہے تو جواب ملا "حسن اخلاق" مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو ضرر نہ پہنچے اور وہ عمل صالح میں لگا رہے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے پیار، ماں باپ کی خدمت، عزیزوں سے حسن سلوک، یتیموں اور بے کسوں کی مدد، انکساری و بردباری، تحمل و استقلال، عفو و درگزر، ہمدردی و انسانیت، محبت و مروت، سخاوت و شجاعت کا شمار اخلاق میں ہوتا ہے۔ "حسن اخلاق" حرکات و سکنات سے تعلق رکھنے والا ایک ایسا رویہ ہے جو سارے کردار پر حاوی ہے۔ جب تک ہمارے اخلاق اچھے نہ ہوں گے نہ ہمیں اس زندگی میں راحت ملے گی اور نہ اس زندگی میں نجات۔ نہ ہم سے اللہ راضی ہوگا اور نہ اس کا رسول۔

اس مختصر مضمون میں اخلاق کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ایمانداری و راست بازی کو لیجیے۔ ہمارے معاشرے میں آج کل یہ مفقود ہے۔ عہد قدیم کے مورخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لئے تین باتوں کی تعلیم دیا کرتے

خیال رکھتے تھے۔ وہ سکھتے شہسواری، تیر اندازی اور راست بازی۔ اب تو شہسواری اور تیر اندازی کی چنداں ضرورت نہیں مگر راست بازی اخلاق کا ایک ایسا جزو ہے جس کے بغیر ہماری ساری تہذیب جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہوگی۔ بازار میں آپ کو کوئی سونے کی چیز خریدنی ہو تو اس کی پرکھ سونے کو کسوٹی پر کسی جاتی ہے کیونکہ ہلکے دھاتوں کا رنگ روپ چمک دمک سونے جیسی ہوتی ہے۔ اسی طرح اوصاف حمیدہ کی پرکھ بھی راست بازی سے کی جاتی ہے۔ ہمارے دیش کے نیتا مہاتما گاندھی نے سچائی اور راست بازی کو پرستش کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ ہمارے آقا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی امین کے لقب سے مشہور تھے۔ راست بازی صرف دل کی صفائی، حق و صداقت، سچائی و انصاف ہی کا نام نہیں بلکہ نفس کی ساری شرارتوں کو روکتے اپنے ضمیر کی پابندی کرنے اور اپنے سارے انسانی فرائض کو بخوبی انجام دینے کا نام ہے۔ اسی میں اخلاقی جرأت بھی شامل ہے جسمانی جرأت کی تو ہم داد دیتے ہیں لیکن اخلاقی جرأت پر نگاہ کچھ کم ہی رہتی ہے۔ سپاہی لڑنے میں مشہور ہوتے ہیں لیکن ہم چشموں کے مزاح یا دل لگی یا ہنسی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے اس کے برعکس نازک بدن اور گل اندام خواتین میں بھی انتہا درجہ کی اخلاقی جرأت کا ثبوت جیسا تاریخ کے صفحوں میں ملتا ہے۔ رضیہ سلطان کی بہادری، چاند بی بی کی دلیری، نورجہاں کی ہمت و استقلال، انگلستان کی ملکہ الزبتھ، فرانس کی جون آف آرک کا تدبر سب اخلاقی جرأت پر مبنی تھے۔ سقراط کا زہر کے گھونٹ پی جانا، حضرت امام حسینؓ کا کربلا میں خوشی سے جان دے دینا، ٹیپو سلطان شہید کا جنگ آزادی میں سر کٹانا، ابراہم لنکن یا جان کینیڈی یا مہاتما گاندھی کا اپنے اصولوں کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دینا، سب راست بازی یا اخلاقی جرأت کے انمول نمونے ہیں۔ سائنس داں گیلیلیو نے اپنی تحقیقات کے فاش کرنے کی کوشش میں اتنی سختیاں سہی کہ وہ نیم مردہ ہو گیا تھا۔

غرض اخلاقی جرأت ایمانداری و راست بازی کا دوسرا نام ہے۔ اپنے فرائض کو دل و جان سے انجام دینے کا نام اخلاقی جرأت ہے۔ جواں مردی و مستقل مزاجی کا نام اخلاقی جرأت ہے۔ دنیاوی آلائشوں سے پاک رہنے کا نام جرأت ہے۔ بے کھٹکے کام کرنے کا نام جرأت ہے۔ آج کل عالم اسلام میں اسی جرأت کا فقدان ہے۔ ہمیں اس دنیا میں سرفرازی حاصل کرنی ہو اور اس دنیا میں رضائے الٰہی مقصود ہو تو ایمانداری، راست بازی اور اخلاقی جرأت ہم

پھر لازم آئے گی۔ رسول اکرمؐ سے کسی نے پوچھا کہ مجھ میں چار برائیاں ہیں، چوری، شراب، زنا اور جھوٹ۔ بہ یک وقت چاروں ترک کرنا مجھے دشوار ہے۔ کسی ایک کو فوراً ترک کر سکتا ہوں۔ ان چار برائیوں میں سے کونسی برائی فوراً ترک کرنا میرے حق میں مفید ہوگا؟ تو جواب ارشاد ہوا جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ ظاہر ہے کہ اس برائی کو ترک کرنے سے باقی سب برائیاں خود بخود غائب ہوں گی۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جھوٹ 'ام الخبائث' یعنی ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ شروع شروع میں راست گوئی تلخ معلوم ہوتی ہے۔ حق کی تلخی زہر لگتی ہے۔ اسی کی وجہ سے نبیوں کو مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ اسی نے موسیٰ کو مدین سے بھگایا، یوسف کو جیل بھیجا، حضرت عیسیٰ کو سولی پر چڑھایا اور رسول اکرمؐ کو مکہ سے نکالا۔ لیکن آخری جیت تو راست گوئی ہی کی ہوئی۔ یہ وہ پرُ رحمت ہے جس کی برکت سے انسان اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ وہ نہ ہو تو نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ شیطانی اثرات جڑ پکڑنے لگیں گے۔ کمزوروں، بے کسوں اور بیواؤں کا حامی کوئی نہ ہوگا۔ تہذیب، تمدن، ترقی، قانون، اطاعت، بزرگی اور سارے انسانی رشتے گم ہو کر انسان نوعِ انسانی کا شکاری بن جائے گا۔ اگر ہم راست گوئی، راستی اور ایمانداری کی طرف راغب ہوں تو ہمارا باغ جہاں بھی پھولوں سے سنور جائے گا۔

اسلامی تعلیمات میں اخلاقی جرأت سے ملتا جلتا دوسرا اہم جز مروت ہے۔ اس میں ہمدردی، انسانیت، سخاوت، اخوت، مساوات، محبت سبھی شامل ہیں۔ "دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں"

ہر مذہب میں اخلاق کی کچھ نہ کچھ خاص خصوصیت ہوتی ہے۔ مثلاً یہودیوں میں جابرانہ خصلت، عیسائیوں میں خدمت کا مادہ، بدھ مذہب میں تحمل، بردباری، ترکِ تشدد (VOILENCE) سے نفرت، ہندو دھرم میں رواداری و انفرادیت کی انتہائی جھلک، جین، پارسیوں کی فیاضی اور سکھوں کی دلیری و ملنساری مشہور۔ لیکن مذہب اسلام کی خاص خصوصیت مساوات، اخوت و مروت ہے۔ ہندو دھرم میں ہاتھ جوڑ کر استقبال کیا جاتا ہے۔ دوسرے کا ہاتھ چھوا نہیں جاتا۔ انگریز مصافحہ کرتا ہے لیکن مسلمان بغلگیر ہوتا ہے۔ ذات پات، اونچ نیچ، نسب، نسل، رنگ روپ کی تمیز نہیں ہوتی۔ رسول اکرمؐ غلاموں اور خادموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے۔ مسکینوں و غریبوں کی عیادت فرماتے تھے۔ فقراء کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ دکان سے کپڑا خریدا اور دکاندار ازراہِ عقیدت

آپ کے دستِ مبارک کو چومنا چاہا تو آپ نے کہا، "تم بھی لوگ اپنے بادشاہوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ میں بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تم ہی میں سے ایک ہوں۔" یہ تھی خصوصیت آپ ذاتِ اعلیٰ کی جو جملہ عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجی گئی تھی۔

اخوت سے گدائی و بادشاہی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ مروت سے رنج و غم کی تلخیاں مٹ جاتی ہیں۔ جود و سخا کا دریا امڈ آتا ہے۔ عفو و کرم سے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں۔ عرب کی سرزمین میں اسلام کا ظہور حاتم طائی کی سخاوت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ ایک مہمان رات کے وقت اس کے گھر آتا ہے اور اس کے اصطبل میں ایک بہترین گھوڑا بندھا ہوا دیکھتا ہے۔ رات کی مہمانی کے بعد دوسرے دن بوقت رخصت اس گھوڑے کو پانے کی خواہش کرتا ہے حاتم شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے گھر میں پچھلی رات کھانے کے لیے کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اس نے اس گھوڑے کو ذبح کر کے اس کی ضیافت کی گئی تھی۔ مہمان یہ سن کر دم بخود رہ جاتا ہے۔ عربوں کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ آج کل کے گئے گذرے زمانے میں بھی مسلمانوں کی تواضع و مہمان نوازی ابھی کچھ باقی ہے جو مروت کا احسان ہے۔ کہتے ہیں پٹھانوں کا یہ خاصہ تھا کہ جب کبھی کوئی اجنبی دروازہ کھٹکھٹاتا تو میزبان چار چیزیں ساتھ لے کے دروازہ کھولتا تھا۔ گلاس میں پانی، جیب میں پیسوں کی تھیلی، ہاتھ میں لاٹھی اور حقہ۔ مہمان جو چاہے لے، چاہے حقہ پیے، چاہے پانی، چاہے پیسے، چاہے مدد کے لیے لاٹھی لے ساتھ۔

اخلاق کی تیسری اہم کڑی وفا ہے۔

"کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ـــ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں"

کسی اصول سے جذباتی محبت اور دل و جان سے لگاؤ کا نام وفا ہے۔ وفا میں دغا کا عنصر نہیں ہوتا۔ جہاں وفا نہ ہو تو خسارہ ہی خسارہ ہوگا۔ جے چند نے پرتھوی راج سے دغا کی۔ دولت خاں لودھی نے ابراہیم خاں لودھی سے دغا کی۔ میر جعفر نے سراج الدولہ سے دغا کی۔ میر صادق نے سلطان شہید سے دغا کی۔ ہر مرحلہ میں نتیجہ تباہی رہا اور ملک کو سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔ کبھی کبھی انسان جانوروں کی خصلت سے بھی سبق اٹھاتا ہے کتے کو ایک ہڈی اس کی وفا کی ضامن بن جاتی ہے لیکن بروٹس سیزر کی میز پر رات میں ڈنر کھائے گا اور دوسری صبح دم سے سیزر کی پیٹ میں چھرا بھونکے گا۔ سیاسی معاملوں میں ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں اعتماد و وفاداری سخت ضروری ہے۔ لاکھوں روپیوں کی تجارت اعتبار پر کی جاتی ہے۔ اگر شوہر کو بیوی

پیدا نہ ہو تو گھر ویرانہ بن جاتا ہے۔ ملک و وطن سے وفاداری، قوم و ملت سے وفاداری، خاندان سے وفاداری، سماجی و اقتصادی و ثقافتی معاملوں میں وفاداری، اپنے مالک، پیشہ اور فرائض سے وفاداری، شرافت کا اصول زنجیر ہے۔ اسلام میں وفاداری کا بڑا مقام ہے۔ خالق و بندہ کا رشتہ وفاداری سے منسلک ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ "میں تمہارا خالق ہوں اور تم میری مخلوق" جب تک خالق کی اطاعت و وفاداری جاری کرتے رہیں گے مالک کی رحمت سے سرفراز ہوتے رہیں گے۔ جب اس اطاعت سے روگردانی کریں گے تو غضب الٰہی کا شکار بن جائیں گے۔ اس پہلی ایمان میں یقین پر اور اعتماد و وفا پرست زور دیا گیا ہے۔ ہمارے مذہب میں اسلام سے پہلے ایمان آتا ہے۔ یہاں اللہ پر صدق دل سے اعتماد و وفاداری کا عہد لیا جاتا ہے۔ جو وفاداری اللہ سے کی جاتی ہے اسی قسم کی وفاداری بندوں کے ساتھ بھی چاہیے۔ جو ملازم اپنے حاکم کی اطاعت و وفاداری نہیں کرتا تو وہ برطرف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مالک کا احسان ہے کہ اس کی حکم عدولی و نافرمانی کے باوجود بھی رزق بخشتا ہے۔"

"کریمی خدا ہی کو زیبا ہے بس ـــ جو جرموں پہ کرتا ہے روزی عطا"

جرموں کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ چھوٹا موٹا جرم ہو تو ملازم کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ مسلسل سرکشی پر اتر آئے تو سوائے سزا کے چارہ نہیں۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ جو شخص یا قوم یا ملک حد وفاداری سے نکل جاتا ہے وہ غضب الٰہی کا شکار بن جاتا ہے۔ اور وفاداری کا پہلا زینہ خالق کی وفاداری ہے۔

اخلاق کی چوتھی منزل ایثار و قربانی ہے۔ صحیفہ پاک کا چوتھا پارہ لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا سے شروع ہوتا ہے۔ تم کبھی بھی اللہ کی خوشنودی اور رحمت و عنایت حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ اپنی جان سے پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ عمل صالح میں جو دوستانہ ایثار و قربانی، دریا دلی و فیاضی اور احسان و کرم کا بڑا درجہ ہے۔ اسی لیے زکوٰۃ کو دین کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی فرائض میں کلمۂ توحید، صوم و صلوٰۃ کے بعد اسلامی عمارت کا چوتھا ستون زکوٰۃ ہے۔ حج بیت اللہ عمارت اسلام کا مینار ہے۔ جس کے بغیر بھی عمارت کی تعمیر ممکن ہے لیکن مذہب کے چوکھٹے کی چار دیواری مضبوط نہ ہوں تو عمارت کیسے باقی رہے گی؟ ہر مولوی مذہب کے ہر مسئلے پر تدریس کا حق گروہ وعظ میں گھنٹوں تک پانی بہاتا ہے لیکن زکوٰۃ کا ذکر مشکل سے ہی کرے گا۔ اس لیے کہ وہ خود زکوٰۃ نہیں دیتا۔ صرف زکوٰۃ لینا جانتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں زکوٰۃ کی

کرتا ہی پڑے جنگ کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ زکوٰۃ، صدقہ، خیر خیرات، فدیہ وغیرہ سے دولت گھٹتی نہیں بڑھتی ہے۔ زکوٰۃ بھی علم کی طرح وہ دولت ہے جو لٹانے سے بڑھتی ہے اور بچانے سے گھٹتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں صرف یہی نہیں کہا گیا کہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنی سب سے پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں دو۔ ہماری سب سے پیاری چیز خود ہماری جان ہے۔ اس کو اللہ کی راہ میں دے دینا تو سب سے بڑا درجہ حاصل ہوگا۔ شہید کا درجہ ہے۔ اسی لیے جہاد کا حکم آیا ہے۔ ہماری نمازوں میں حضرت ابراہیمؑ کا نام کئی مرتبہ لیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز چیز اپنے لخت جگر حضرت اسماعیلؑ کی قربانی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر قربانی کیا اس سے بڑی نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں کا عروج ایک صدیوں کے دور تک رہا تھا اور سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس لیے رہا کہ وہ اپنی جان ہتھیلی پہ لیے پھرتے تھے۔ یہ ایثار و قربانی کا ہی نتیجہ تھا۔ ملک و ملت کے لیے مر مٹنے کا ذوق تھا۔ اور اللہ کی راہ میں جان دینے کا شوق تھا جس کی وجہ سے ان کا نام صفحۂ ہستی پر درخشاں ستارے کی طرح آج بھی چمک رہا ہے۔ اس ایثار و قربانی کی کمی کی وجہ سے عالم اسلام آج صرف تماشائی بن کر رہ گیا ہے۔

"گلشن میں بہاروں کی مثال ان کا ابھرنا تھا — وہ لوگ ہیں گلشن میں صرف تماشائی"

ایثار و قربانی میں جہاد کے بعد دیگر بے شمار قسم کے پہلو ہیں، اپنا مال، اپنا علم، اپنا ہنر اپنی حکمت، اپنی صلاحیت، اپنی قابلیت اور اپنی رقت دوسروں کی مدد میں صرف کریں تو وہ بھی ایثار و قربانی ہوگی۔ اللہ میاں ہمیشہ ہماری جان نہیں مانگتے۔ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ وہ جیسا رحیم و کریم، محب و مہربان ہے اسی قسم کی جھلک انسانوں میں بھی آئے۔ بندے صرف لینا ہی نہیں دینا بھی سیکھیں۔ صرف کمانا ہی نہیں خرچ کرنا بھی سیکھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ مارشل پلان سے یورپی اقوام کو کروڑوں کی مدد دی گئی۔ امریکہ غریب نہیں ہوا۔ اس نے ساری دنیا کو اپنی دولت بانٹی پھر بھی امیر رہا۔ جب رسول پاکؐ نے راہ حق میں مال مانگا تو اس وقت حضرت ابوبکرؓ اپنے گھر میں جو کچھ بھی تھا حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ فکر عیال بھی چاہیے تو جواب عرض کیا تھا۔

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس — صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

ہر شخص صدیق اکبرؓ کی قربانی تو نہیں کر سکتا لیکن کم از کم زکوٰۃ جو صرف ڈھائی فیصد

زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرے۔ اپنی صلاحیت عقل و شعور، علم و ہنر اور تجربے کا ذخیرہ تو خرچ کرے اللہ میاں نے جو طاقت، قوت اور اقتدار بخشا ہے اس کا صحیح استعمال کرے، کچھ لوگ شفقت غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور بے کسوں کی حمایت کرے۔

"ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں"
دل میں درد رکھے کرے

"یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا"
"یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"
وہ بھی یاد رکھے۔

"کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر — خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر"

اللہ میاں صرف یہ چاہتا ہے کہ انسان خود غرض نہ بنے، بخیل نہ بنے، ظالم نہ بنے۔ جب قطب عالم سے ایک مرید نے پوچھا کہ آدھا مسلمان کون ہے اور پورا مسلمان کون ہے۔ جواب ملا کہ آدھا مسلمان تو وہ شخص ہے جو رسوم و صلوٰۃ کا پابند اور شریعت احمدی کا عاشق ہے جو اپنے تقویٰ کی بدولت ہوا پر اڑے اور پانی پر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھے لیکن پورا مسلمان تو وہ ہے جو محنت کرے، ریاضت سے روٹی کمائے اور جو چیز ریاضت و محنت سے حاصل ہو آدھی خود کھائے اور آدھی اپنے بھائی کے سامنے رکھے۔

"آدھی روٹی سے بھی ایک مردِ خدا — کچھ فقیروں کو بھی دیتا ہے کھلا"
"بادشاہ کو ملک بھی مل جائے گر — پھر بھی چاہے گا کہ لے دوسرا"

دوسروں کو کچھ دینا سیکھ لیں تو بہتر ہو، قرضِ حسنہ کا مفہوم سمجھ لیں تو بہتر ہے، کچھ نہ دے سکیں تو کم از کم دعا دینا اور دعا کرنا سیکھ لیں تو بہتر ہو۔ بھلائی نہیں کر پاتے تو برائی بھی نہ کریں تو بہتر ہو۔ کسی شاعر نے یہاں تک کہہ دیا۔

خدا کے عاشق ایسے ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا
جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

مطلب یہی کہ انسان کا شیوہ انسانیت و ہمدردی ہے۔ اور یہ جذبہ اس وقت تک

پیدا نہ ہوگا جب تک مسلسل ایثار و قربانی کا جذبہ ہم میں نہ ہو۔

اخلاق کی پانچویں منزل صبر و استقلال کی ہے۔ بے سکون آدمی تھوڑی سی تکلیف پر گھبرا جاتا ہے ؎

مرا دعویٰ ہے کہ جو ہمراہ ساماں نہ ہو — مشکلیں ایسی نہیں جو آساں نہ ہوں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مشکل کے وقت ہمت ہارنا نہ چاہیے۔ مصیبت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ تکالیف کو تجربے کا پہلا زینہ سمجھ کر صلاحیت کا آخری قطرہ بروئے کار لانے میں لگا دینا چاہیے۔ کٹھن منزل کو ترقی کا شاہراہ سمجھ کر رفتار کی تیزی بڑھانا چاہیے۔ زندگی کو قدرت کا عطیہ سمجھ کر بہادری، اعتماد اور کوشش کے ذریعے کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔ اور اللہ پر ایسا بھروسہ رکھنا چاہیے ؎

"مشکلوں کی بھی کوئی حالت ہے صبر — مشکلیں آساں وہی فرمائے گا"

یہ سچ ہے کہ کامیاب زندگی آسان نہیں ؎

"زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی"
"برتر از سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی"

گیدڑ اور لومڑی کی نہیں، شیر کی زندگی بسر کرنی ہو تو شیر کی خصوصیت طاقت، قوت اور پھرتی بھی چاہیے۔ مدار قوت حیدری علی شیر خدا کی سوکھی روٹی پر تھا مگر ان کا جذبہ اساس یقین اور فضل الٰہی پر تکیہ ہو تو اب بھی قسمت بدل سکتا ہے۔ اس کے لیے علم و عمل صبر و استقلال چاہیے۔ ایسا صبر جس کا نمونہ ہمیں حضرت امام حسینؓ کی زندگی میں ملتا ہے۔

ایک مرتبہ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو ایک نہایت گرم شوربے کا پیالہ ایک غلام کی غلطی سے آپ پر گر پڑا۔ آپ درد سے بلبلا اٹھے۔ ملازم پریشان تھا لیکن حضوری قلب سے فوراً ایک آیت کریمہ کو دہرایا "جنت ان کے لیے ہے جو غصہ کو دبا لیتے ہیں۔" حضرت حسینؓ نے کہا "میں غصہ نہیں کر رہا ہوں" ملازم نے آیت کریمہ کی دوسری کڑی پڑھی "جنت ان کے لیے بھی ہے جو عفو و درگزر سے کام لیتے ہیں۔" امام عالی مقامؓ نے کہا "میں نے تیری خطا معاف کر دی۔" ملازم کو شخص علیہ ایک اور آیت کریمہ سے کام لیا "اللہ رحمن و رحیم ہے اور مہربان لوگوں پر اس کا رحم و کرم خوب برستا ہے۔" امام حسینؓ نے غلام کو آزاد کیا اور بخشش میں چاندی کے چار سکے بھی دیے۔ یہ تھی سزا اس شخص کی جس نے حضرت امام حسینؓ کو تم مردہ کر دیا تھا کاش کہ

ہم میں اس قدر تحمل و بردباری نہ ہو تو کم از کم چراغ پا ہونے کی خصلت تو چھوٹ جائے۔

ایک مرتبہ دورانِ جنگ حضرت علیؓ دشمن کے سینہ پر چڑھ بیٹھے۔ بس چھرا بھونکنے ہی والے تھے کہ زیر دست اپنے منہ کا سارا لعاب حضرت علیؓ کے چہرے پر پھینک دیا۔ حضرت علیؓ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے دشمن کو آزاد کر دیا۔ یہ تو تعجب کا مقام تھا۔ سبب پوچھا گیا تو حضرت علیؓ نے کہا "پہلے تو ایک اصول کا معاملہ تھا۔ راہِ حق میں لڑائی ہو رہی تھی۔ پھر یہ تھوک دینے کے بعد دشمن کو قتل کرنا ذاتی معاملہ بن جاتا۔" اس نے یہ تھوکا اور وہاں نے جان لی" دشمن نے فوراً کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ کسی کی جان بچی اور حق کی جیت بھی ہوئی۔

اخلاق کے یہ کرشمے ہیں۔ تحمل کے بھی عجیب مدارج ہوتے ہیں۔ غرض صبر و استقلال، اطمینان و سکون سے ہم اپنے فرائض انجام دیں تو ہمیں ہر مقام پر کامیابی حاصل ہوگی۔

اخلاق کی سدھار کا یہ مختصر سا خاکہ اس امید سے پیش کیا جا رہا ہے کہ ہمارا دین بہتر ہو۔ دنیا جنت بھی ہو سکتی ہے اور دوزخ بھی۔ یہ ہمارے اخلاق و کردار پر منحصر ہے۔ میٹھی بولی سے ہم لوگوں کے دل موہ لے سکتے ہیں اور کڑوی بولی سے امرت بھی پلا نہیں سکتے۔ آج کل مسلمانوں کا بول چال اور طرزِ زندگی میں نمایاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

"پہنچتے سب تو ہیں ہوں اس کا شریک تیم — پہلے وہ یہاں کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم"

یہ قلبِ سلیم اخلاق سے پیدا ہوتا ہے۔ عزت، دولت آتی جاتی ہے۔ مل مل جاتی ہے، چھن جاتی ہے۔ لیکن قلبِ سلیم وہ روحانی فرحت بخشتا ہے جو زیست کا حاصل ہے۔ قلبِ سلیم آسانی سے نہیں پنپتا۔ اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ قیمت اخلاق کے چند اصولوں میں مضمر ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی راست گوئی، ایمانداری، اخلاقی جرأت، محبت، مروت، صدق و صفا، وضع داری، ضبط و اعتماد، ایثار و قربانی اور صبر و استقلال۔ یہی اسلامی تعلیمات کا لب لباب ہے اور اسی کو عام کرنا ہماری جدوجہد کا اصل غرض و غایت۔

مسلمانوں کے عروج و زوال میں تعلیم کا رول

قوموں کا مستقبل درسگاہوں کے اندر ڈھلتا ہے۔ علم کے چراغ سے تہذیب و تمدن کے ایوان منور ہو جاتے ہیں۔ عقل و شعور کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ علم کائنات کا ساز ہے۔ حقیقت کا راز ہے۔ زندگی کا آئینہ ہے۔ انسان کا جوہر ہے۔ کارزار حیات کا رہبر ہے۔ ہمارے تمدن کی آبرو ہے۔ دنیا کی جنت ہے دین کی روح ہے۔ جنگ کا ہتھیار ہے۔ امن کا ساتھی ہے۔ غم کا سہارا ہے۔ مسرت کا چشمہ ہے اور اللہ کا نور ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جو لٹانے سے بڑھتا ہے اور بچانے سے گھٹتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جس کو پا کر انسان مقلب القلوب بن جاتا ہے۔ اور اس کو کھو کر اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مقام سے نیچے گر پڑتا ہے۔

مذہب اسلام کی ابتدا غار حرا کی اس مبارک ساعت سے شروع ہوتی ہے جبکہ روح الامین نے رسول عربی ﷺ کے سینہ کو درس "اقرا" کا سبق دیا تھا۔ یعنی "پڑھ"۔ ہماری مقدس کتاب قرآن بھی اسی معنی کا حامل ہے۔ یعنی اسلام علم کے جوہر کو عام کرنے کے لیے ظہور میں آیا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اسلام سے زیادہ کسی اور مذہب نے حصول تعلیم پر اس قدر زور نہیں دیا۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک گھنٹے کا تفکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ایک عالم سے ایک گھنٹہ کی صحبت بہتر ہے ایک ہزار راتوں کی عبادت سے۔ ایک اور حدیث شریف میں آیا ہے:

"تعلیم کا حاصل کرنا تقویٰ کے برابر ہے۔ اس کا تذکرہ اللہ کی عبادت ہے۔ اس کی تحصیل اللہ کی خوشنودی ہے۔ وہ جنت کی کنجی ہے نجات کا سامان ہے۔" حصول علم پر شدت اصرار کا یہ اثر پڑا کہ چند ہی عرصہ میں دنیا کا کوئی ایسا علم نہ تھا جس پر مسلمان حاوی نہ ہو گیا۔

فلسفہ، طب، ہندسہ، نجوم، تاریخ، ادب، جغرافیہ، کیمیا، سیاست، حدیث، فقہ غرض ہر شعبہ میں وہ کمال حاصل کر گئے۔ حکومت وثروت وسطوت اُن کی قدم چومنے لگی۔ عزت و دولت وعظمت نے ان کا استقبال کیا۔ تہذیب وتمدن وانسانیت کے وہ پیشوا بنے۔ قوموں اور ملکوں نے ان کی بزرگی کو تسلیم کیا۔ جب علم کا جوہر ان کے ہاتھ سے چھن گیا تو وہ قعر مذلت میں گر پڑے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے عروج وزوال میں تعلیم کا وہ رشتہ ہے جو جسم کا روح سے۔ اسی لیے کہتے ہیں؎

"بے علم کا جینا بھی ہے اک طرح کا مرنا   جیسے تن بے روح کو جلا دو یا دبا دو"

اب یہ ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے صحیح مفہوم کو سمجھ جائیں۔ تعلیم کا مقصد یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کرنا نہیں ہے۔ تعلیم سوچنے سمجھنے کی ترقی کو کہتے ہیں۔ عقل شعور کا نشانہ کی ہر شئے کو جاننے اور پرکھنے کو کہتے ہیں۔ انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے اُن سے فائدہ اٹھانے کو کہتے ہیں۔ تدبر و تفکر سے چیزوں کو اختراع کرنے کی اہلیت کو کہتے ہیں۔ اپنے کام کی ترتیب، فرائض کی انجام دہی اور نیکی و بھلائی کی قبولیت کو کہتے ہیں۔ جہاں انسانی مشاہدہ کام نہیں کرتا وہاں عقل و شعور و قیاس کے ذریعہ معلومات حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ خیالات کے معنی دریافت کرنے اور اُن معنوں کے بل بوتے پر اصولوں کو تراشنے کو کہتے ہیں۔ علم کا دائرہ وسیع ہے۔ وہ ساری کائنات پر مسلط ہے۔ معلومات کا مجموعہ ہے تحقیقات کا منبع ہے۔ انسانی سوچ کا نتیجہ ہے۔ بلند خیالی کا سرچشمہ ہے۔ مذہب کا ذخیرہ ہے۔ نامعلوم حقیقتوں پر روشنی ڈالنے کا وسیلہ ہے۔ خالق کی قدرت کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

تعلیم معلومات کے صرف ذخیرے ہی کو نہیں کہتے بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو سنوارنے کی صلاحیت کو کہتے ہیں۔ تعلیم کا تربیت سے چولی دامن کا رشتہ ہے۔ یہاں ضروری و غیر ضروری چیزوں میں فرق و امتیاز کرنا شامل ہے۔ یہاں زندگی کے دھارے کو راہ راست پر موڑنا لازم بن جاتا ہے۔ معیشت کے آداب سمجھنا، وقت کی قدر و منزلت کرنا، اخلاق عادات کو سدھارنا، نیکی، بھلائی، سچائی و ہمدردی کو اپنا شعار بنانا، بزرگوں کا ادب کرنا، چھوٹوں پر شفقت رکھنا، غریبوں، یتیموں، محتاجوں، مسکینوں و ضرورت مندوں کی امداد کرنا، دکھی دلوں کو محبت سے گرمانا، برائی سے نفرت، بھلائی سے رغبت رکھنا،

غیض و غضب، مکر، دانائی، دغیرہ وغیرہ سبھی کچھ تربیت کی زد میں آتے ہیں جو تعلیم کے صحیح مقصد کی تکمیل کرتے ہیں۔

تعلیم کی افادیت و مفہوم سمجھ میں آجانے کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ تعلیم کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے علماء کے نزدیک علم تین طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو مشاہدے کے ذریعے جہاں انسانی تجربہ ضروری ہے۔ کائنات کے ہر ذرے میں قدرت نے حکمت کے ایسے موتی بکھیر دئے ہیں جن پر غور کرنے سے چاروں طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ علامہ شبلی نے خوب کہا ہے:

"برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ـــ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار"

دیکھنے والوں کے لیے ہر درخت کا ہر سبز پتہ خالق کی قدرت کا ایک ضخیم دفتر ہے۔

ہمارے بچے جب اسکول میں پڑھتے ہیں کہ درختوں کے پتوں کی وجہ سے گندی ہوا پاک ہوا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ پتے اگر کام نہ کریں تو آکسیجن کا اسٹاک ختم ہو جانے کے باعث ہم ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح بظاہر شہد کی مکھیاں ہمارے رنگ برنگے پھولوں اور پھلوں پر منڈلاتی نظر آتی ہیں لیکن ان کی کاوش سے ہمیں شہد جیسا میٹھا امرت ملتا ہے۔ انسان میں جب تک رگ ہے وہ زندہ ہے لیکن زندگی کے لیے جسم کے کتنے اجزا ضروری ہیں وہ کوئی ڈاکٹر گرے (GREY) کی اناٹمی کی کتاب دیکھے۔ اس میں ہزاروں نہیں لاکھوں نام درج ہیں۔ انسان کا دماغ کیسے کام کرتا ہے اور دوران خون کے لیے دل کی کیا ذمہ داری ہے وہ کوئی میڈیکل ڈاکٹر سے پوچھے۔ ہاروے (HARUET -) سے پہلے تو دل کی حقیقت کا پتہ ہی نہیں تھا۔ آج علم کے ذریعے انسان چاند پر پہنچ گیا ہے۔ فضا میں اڑنا، سمندر کی تہہ جاننا، ستاروں کو اپنی آنکھوں کے قریب کرنا، بجلی کی قوت پیدا کرنا، دل کے بجھتے ہوئے مریض کو ڈاکٹر کے نشتر سے دوبارہ اجاگر کرنا آج کل یہ سب علم کی بدولت ممکن ہو سکا ہے۔ یہ سب علم حاصل کرنے کے پہلے زینے سے جس کو سائنس ٹیکنالوجی کہتے ہیں ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ فلسفہ ہے، جہاں مشاہدہ کام نہیں کرتا۔ تجربہ گاہ (LABORATORIES) ساتھ نہیں دیتی۔ اس کائنات میں کئی ایک ایسی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ قیاس کرنا پڑتا ہے مثلاً روح، خوبصورتی، نیکی، بھلائی، سچائی، توقیر، اخلاق، عزت، نفرت، حکمت، لذت، اقدار وغیرہ وغیرہ غیر مادی چیزیں ہیں۔ ان چیزوں کی موجودگی اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن یہ

چیزیں بازار میں بکتی نہیں اور سائنسدان تجربے کے لیے میز پر لا سکتے نہیں۔ وہ صرف دماغ سے سوچی سمجھی جا سکتی ہیں۔ تخیل کے ذریعے اُن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خود خوش پیدائش کی اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے۔ انسانی فکر و تدبر سے ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے، نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں اور اصول تراشے جا سکتے ہیں۔ یہ علم حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ ہے۔ تیسرا طریقہ وہ ہے جس کو الہام کہتے ہیں۔ یہ صرف خدا کے خاص برگزیدہ بندوں کے لیے مخصوص ہے۔ بندہ کا اس میں دخل نہیں۔ یہاں عقل بھی کام نہیں کرتی۔ مالک جس کو چاہتا ہے اس پر رحم و کرم کی بارش ہوتی ہے۔ اَبرِ واحدیت عرفان کا سمندر اُمنڈ آتا ہے۔ علم و حکمت کے موتی رولے جاتے ہیں۔ حقائق کا پردہ فاش کیا جاتا ہے۔ اس صف میں صرف اولیاء انبیاء آتے ہیں جن میں روحانیت اتنی بھری ہوتی ہے جو ناممکنات کو ممکن کر دکھاتے ہیں۔ موسیٰؑ نے یدِ بیضا کا معجزہ پیش کیا۔ لاٹھی پھینکی تو اژدہا بن گیا۔ عیسیٰؑ نے مردے کو زندہ کیا۔ دستِ شفقت سے برص کے بیمار پر نظر ڈالی اور برص کی بیماری دور ہو گئی۔ رسولِ عربیؐ نے شق القمر کا معجزہ کر دکھایا۔ اگر موسیٰ کلیم اللہ کو طور پر جلوۂ خداوندی نصیب ہوا تو ہمارے آقا رسولِ کریمؐ کو قربتِ خداوندی معراج کے ذریعہ عرشِ بریں پر نصیب ہوئی۔ یہ صرف اللہ کے عاشقوں کا حق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ پر بھروسہ رکھا تو آگ گلزار بن گئی۔ ہم اور آپ خاک ہو جاتے ؎

"بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ـــ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی"

غرض علم حاصل کرنے کے تیسرے طریقہ کا انحصار وہبی ہے جس میں آپ اور ہم نہیں آ سکتے۔ اس لیے عام انسانوں کے لیے حصولِ علم کے صرف پہلے دو طریقے باقی رہ گئے ہیں چونکہ ہمارے آقا خاتم النبیینؐ تھے تیسرے طریقے کی اب کوئی امید نہیں۔

تعلیم کے قاعدے، معنی اور طریقے معلوم کرنے کے بعد مسلمانوں نے اس نعمتِ عظمیٰ سے کیسے فائدہ اٹھایا جاننا ضروری ہے۔ انہوں نے علم کے میدان میں جو کمال کر دکھایا اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو ایک مثلث کی شکل نظر آئے گی۔ اس مثلث کی تین لکیریں ہیں۔ خدا بینی، خود بینی اور جہاں بینی۔ دنیا کے سارے علوم کو ان تین حصوں میں بانٹ دیا جا سکتا ہے۔ گویا سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند۔ ہمارے سارے علوم کا منبع حاضر روحانیت کی تشریح کر رہا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے مفکر، مدبر، عالم، فاضل اپنی ساری

قوت کو ذاتِ الٰہیہ کو سمجھنے اور صفاتِ عالیہ پر بحث کرنے میں صرف کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف فلسفہ کا عروج اور دوسری طرف احکامِ الٰہی کے نافذ ہونے پر نظامِ زندگی جو بنتا ہے اس کا تجزیہ۔ جب اسلامی فلسفہ کی بنیاد پڑی تو ہمارے مفکروں کو ارسطو و افلاطون کی تحقیقات بھی ہاتھ لگیں اور قرآن کی بھی۔ لیکن یونانی تخیلات اور اسلامی تخیلات میں کچھ تضاد بھی ہے۔ ہمارے علماء و حکماء نے اس تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی یعنی مذہب و عقل کی جو جنگ سی چھڑ گئی تھی اس میں صلح۔ یہ بڑا مشکل امر تھا۔ مگر خوشی یہ اس بات کی ہے کہ ایک حد تک ہمارے مفکر، ہمارے اس کام میں کامیاب رہے۔ چونکہ فلسفہ غیر یقینی تصورات کا تجزیہ کرتا ہے اس لئے اس میں مذہبی ہونے کا کافی دخل ہے۔ جہاں مذہب کا نام لیا گیا وہاں خالق کی کارسازی کا اظہار لگ گیا۔ اور عقیدت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ذاتِ الٰہیہ پر نظر اس کی خصوصیات کی جانچ پڑتال کا کام رہ گئی اور مختلف ہر بانی پر غور و خوض، وحدانیت، ربوبیت، عدل و انصاف، رحم و کرم، ایمان و ایقان اور مالک کی دیگر ان گنت خوبیوں پر دفتر کے دفتر لکھے گئے۔ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کا حیرت انگیز نظام کس خوبی سے چلا آ رہا ہے، ہمارے فلسفہ کا یہی موضوع بن گیا۔ جہاں خصوصیاتِ الٰہیہ کا ذکر آیا وہاں علم و دانش کے کئی سرچشمے پھوٹ پڑے۔ نمازی کی تسبیح کے ہر دانے مالک کی کسی خاص صفت کی شہادت دینے لگے۔ علماء نے اس پر تدبر کیا، تفکر و تدبر، تفتیش و تحقیق کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ازل سے ابد تک جو عامل و کامل ہے اس کے کمال و جمال کی تشریح علوم کے ایک نادر ذخیرہ میں تبدیل ہو گئی۔ گویا خدا بینی ایک دعوت تھی جہاں جب انسانی فکر کا پرچم لہرایا تو ساری کائنات کا کرشمہ روزِ روشن کی طرح سامنے آ گیا۔

خدا بینی کے ساتھ ساتھ خود بینی بھی منسلک رہی۔ یہاں سے نفسیاتی تجزیہ (PSYCHOLOGICAL INSIGHT) شروع ہوتا ہے۔ ہر چیز کی نشو و نما اس کی ضد سے ہوتا ہے۔ آگ اور پانی، خیر و شر، تاریکی اور روشنی، سکھ و دکھ، اونچ نیچ، بھلا برا، صبح شام، ٹھنڈا گرم، جنت دوزخ، ہر جگہ ایک کا دوسرے سے ٹکراؤ ہے۔ مالک کا رحم و کرم، فضل و عنایت، کمال و جلال، قدرت و عزت، علم و حکمت، عظمت و شان کچھ اور ہی سبق انسان کے لیے پیش کرتا ہے۔ لیکن بندہ اس ہر صفت کے مدِ مقابل کچھ اور ہی گل کھلاتا ہے۔ اس کی سرکشی

مسٹ پرستی، اس کی تنگ نظری، جہالت، ریاکاری، مکاری، خود پسندی، اس کی دہشت، غلاظت، وغیرہ وغیرہ کمزوریوں پر جب عقل و شعور کی روشنی پڑی تو انسان میں بھی احساس ہو چلا کہ اسلامی تعلیمات کا مدعا یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر قابو پا لے اور خالق کے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرے کہ وہ خلیفۃ الارض ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علوم کا پھر ایک دریا بہنے لگا۔ انسان اپنی خودی کو پہچاننے لگا۔ ہر انسان میں اپنی خصوصیت بھی موجود ہے۔ اس خصوصیت پر تفکر اور اس کے صحیح استعمال کی وجہ سے مسلمانوں نے ترقی کی اور کائنات کو اپنا ورثہ میں چھوڑ گئے۔ اُن کی سیاسی، اقتصادی، سماجی، مذہبی، اخلاقی ہر قسم کی حالت سدھر گئی۔ یہ اسلامی تعلیمات کا عطیہ تھا جہاں تحصیل علم ہر مومن مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا تھا۔

تیسرے درجے پر جمالیات کا مقام آتا ہے۔ خدا کو اور خود کو دیکھنے کے بعد قدرت کو دیکھنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے خدا بینی، خود بینی اور جمالیات تین الگ الگ مرکز نہیں بلکہ ایک ہی مثلث کی تین لکیریں ہیں اور ان کا آپس میں گہرا رشتہ بھی ہے۔ جمالیات کا تعلق کائنات سے ہے۔ خالق، فرد اور کائنات سب کچھ آئینۂ حق ہے۔ اسلامی مفکروں نے ہمیں بتایا کہ حسن آئینۂ حق ہے اور دل آئینۂ حسن ہے۔ چونکہ ذاتِ الٰہی حسین کا کائنات میں ظہور پذیر ہوئی اور اس کائنات میں فرد بھی ہے اور ساری خلقت بھی تو ان سب کی حقیقت ذاتِ الٰہی سے جا ملی۔ ان حقیقتوں کو جاننے کے لیے اعلیٰ علم چاہیے اور اس علم کے تین درجے بتائے گئے ہیں۔ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ یہ تینوں علم کے درجے جمالیات کے لیے ضروری ہیں۔ اس قسم کے علم سے احتساب کائنات کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جب شیطان مسلمانوں کو بہکا نہ سکا تو عاجز آ کر یہ کہنے لگا

”ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں — ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات“

یہ احتساب کی قوت کا اندازہ ہمیں آج ہو رہا ہے جبکہ مغرب کی اقوام ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔ سائنس کے کرشمے معجزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ ہزاروں میل کی مسافت گھنٹوں میں طے کی جاتی ہے۔ سمندر و دریا کا دل چیر کر تیل کے چشمے نکالے جا رہے ہیں۔ سطحِ ارض کے کسی بھی گوشہ کی کیفیت آنِ واحد میں پھیلائی جا رہی ہے۔ ہزاروں میل اوپر فضا میں اُڑتے ہوئے انسان کے دل کی دھڑکن سائنسدان ایک چھوٹے سے آلے کو کان پر رکھ

سوچ نہیں سکتا ہے۔ علم کے ذریعے غضب کی حیرت ناک ترقی عمل میں آرہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ سب کس نے کیا؟ انسان نے ضرور لیکن وہ رسول عربیؐ کی تعلیمات پر ایمان رکھنے والا انسان جو "مسلمان کہلاتا" ہے نہیں تھا۔ اور نہ ہے۔ رسول عربیؐ کے مقدس مقام پر چلیے۔ آپ کے دسترخوان پر عجیب بہار نظر آئے گی۔ ڈنمارک کا مکھن، ہالینڈ کا شہد، جرمنی کا دودھ، انگلستان کے بسکٹ، فرانس کی ڈبل روٹی، چیکوسلواکیہ کے گلاس، جاپان کی کٹلری، امریکہ کے نفیس پردے، غرض دنیا کے ہر گوشے کی چیز آپ کو وہاں نظر آئے گی۔ اگر کچھ نظر نہ آئے گا تو صرف عرب و حجاز کی کوئی شے۔ بجز عرب کے پہنچے مقدس عربی زبان کی دلکش آواز، اور کھانے والوں کی شکم پروری۔ ناشتہ کے بعد باہر آئیے۔ کہیں جانا ہو تو سواری حاضر ہے۔ کون سی موٹر چاہیے؟ رولس رائس، بینٹلے، کیڈیلاک، شیورلے، مرسڈیز، ٹیوٹا، ڈیملر، ڈاٹسن، نام بتائیے۔ چمکتی ہوئی اسی سال کے ماڈل کی کار مل جائے گی۔ کیا یہ سب عرب میں بنتا ہیں؟ نہیں عرب میں بکتی ہیں بہت سستی۔ ٹیکس وغیرہ کچھ نہیں۔ اللہ میاں کا دیا ہوا تیل موجود ہے۔ رسول عربیؐ کی امت کو سنوارنے کے لیے قدرت نے دولت کے ڈھیر ریت میں دفن کر رکھے تھے۔ آج ان سے عیش منایا جا رہا ہے۔ یہ دولت کب تک کام آئے گی؟ آپ میں علم ہے نہ ہنر، عقل ہے نہ شعور۔ آپ کا طیارہ عربیہ سا نہیں بنتا۔ ایک بھی کیل ڈھیلی ہو جائے تو مرمت کے لیے امریکہ چاہیے۔ اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ اس کو ٹھیک کر لیا جائے۔ حالانکہ وہ بھی جانا پڑتا۔ بازار گیا تو یوں لگا کہ جنت کا ایک گوشہ اللہ میاں نے وہاں بھی بند کر دیا ہے۔ جوہری بازار پر نظر پڑی تو حیرت ہوئی۔ میلوں لمبی سڑک سونے کے زیورات سے چمکتی دمکتی صرف زرد ہی زرد سا ہے بازار میں کسی عرب کی دکان نہ تھی۔ سب کے سب باہر کے۔ تو بے گجراتی سندھی اور پنجابی ہمارے ملک کے باشندوں کو دیکھ کر خوشی تو ہوئی۔ لیکن دل میں خیال آیا کہ ستر اسی سال قبل تھانہ ڈے سے ہندوستانی مزدور جاتے کے باغات میں مزدوری کرنے گئے۔ وہیں رہ گئے۔ آج ایم کے نام سے اس ملک کا حصہ مانگ رہے ہیں۔ کیا تعجب کہ تاریخ دوسری جگہ بھی دہرائی جائے جہاں علم کا بول بالا نہ ہو یا عقل کا بول بالا بھی نہ ہوگا۔ اصل مضمون کی ابتدا علم کی تبلیغ آیۂ کریمہ "اقرأ" سے شروع کی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مسلمانوں کا ستارہ ہمیشہ بلند رہا جب تک اس آیۂ کریمہ کے مفہوم کو وہ ٹھیک سمجھ بیٹھے تھے۔ اب جبکہ وہ

بھلا بیٹھے ہیں تو عزت کی زندگی نہیں، جیسے بھکاری ہو گیا ہے یہ۔ مٹھی بھر یہودیوں نے سارے عربوں کو تنگ میں دم کر رکھا ہے۔ ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے مقدس مقامات جیسے بیت المقدس کو پھر سے حاصل کر لیں۔ رہی روٹی اس لیے مل رہی ہے کہ مالک کسی کو بھوکا نہیں رکھتا ہے

"ہمیں کو ہے زیبا خدا اس کو بس ــــ جو ترجموں پہ کرتا ہے روزی عطا"

جو حال عرب کا ہے، اس سے بھی بدتر حال دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کا ہے۔
گو کہ عرب میں تیل کے خزانوں کی وجہ سے ظاہری خوش حالی نظر آتی ہے۔ دیگر حصوں میں جیسے بنگلہ دیش، یوپی، بہار، اڑیسہ اور بھارت کے دیگر صوبوں میں جہاں ایک وقت میں تیرہ چودہ کروڑ انسان بستے ہیں، جہالت، غربت، تنگ دستی اور مجبوری کا یہ عالم ہے کہ ان کی زندگی کیڑے مکوڑوں کی زندگی سے بدتر ہو گئی ہے۔ اس لیے کہ وہ علم کے جوہر سے خالی ہیں۔ اگر علم ہوتا تو ہوش آتا، احساس و شعور پیدا ہوتا، حکمت و عقل سے اپنی حالت درست کرتے۔ بے جا رسوم، اسراف، توہمات اور تنگ دستی سے بچ جاتے۔ محنت و کاوش سے خود کماتے۔ تکلیف تو اس بات کی ہے کہ جب ساری دنیا جاگ گئی ہے تو مسلمان ابھی خواب خرگوش میں پڑے ہیں۔ ان میں علم کا فقدان ہے۔ کسی بھی یورپ یا امریکہ کی اہم یونیورسٹی میں جائیے تو ایک دو نوبل لاریٹ آپ کو مل جائیں گے۔ تقریباً پچاس اسلامی ملکوں میں بسنے والے ایک سو کروڑ مسلمانوں کا واحد نمائندہ جو اس صف میں آتا ہے وہ عبدالسلام ہے۔ لیکن وہ بھی صرف آدھے انعام کا حقدار کیونکہ جو تحقیق انہوں نے کی اس کا شریک بھی کوئی دیگر تھا۔ آپ انسائیکلوپیڈیا کے صفحات پلٹیے اور ایجادات کی فہرست تلاش کیجیے۔ دور حاضر میں ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آئے گا۔ تعلیم سے ہم اس قدر دور ہو گئے ہیں جس قدر گدھے کے سر سے سینگ۔

مسلمانوں کی سماجی اصلاح

یہ بات غور طلب ہے کہ کیا آج ہم اس ملک میں عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں یا نہیں اور کیا ہماری حرکات سکنات سے تہذیب کی خوشبو ٹپکتی ہے یا نہیں بلکہ قوم و ملت کے لیے ہم مایۂ ناز ثابت ہو رہے ہیں یا نہیں؟ اگر ان کا جواب نفی میں ہے تو ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہمارا سارا معاشرہ بگڑا ہوا ہے۔ جب تک اس کی اصلاح نہ ہوگی ہماری ترقی ممکن نہیں۔ چودہ سو سال پہلے معاشرے کے جو اصول ہمارے سامنے رکھے گئے تھے ہم ان سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ انہیں پھر سے زندہ کرنے پر ہماری حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ جو اصول اسی وقت سمجھائے گئے تھے وہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ساری انسانیت کے لیے، صرف اسی زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہر زمانے کے لیے اور ہر قوم و ملک کے لیے۔ وہ اصول اخوت و ہمدردی کا سبق دیتے ہیں، مروت و مساوات کے علمبردار ہیں، صدق و صفا، خودداری و غیرت، رحم و کرم، صداقت و شجاعت، عدل و انصاف، ایمانداری و راست بازی، بردباری و انکساری، عفو و درگزر، صبر و استقلال، الفت و محبت اور ایسی ہی کئی اوصاف و خصوصیات کے پیغام سے بھرے پڑے ہیں۔ انہیں ہم نے بھلا دیا ہے۔ ان پر عمل ہماری ترقی کا ضامن ہے۔

مشہور مورخ و دانشور ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ابتدا دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ ایک ایسا ماحول جس میں حد درجہ کا تناسب ہو۔ نہ بہت آرام دہ اور نہ بہت تکلیف دہ۔ موزوں فضا چاہیے جو نشو و نما کی حامل ہو جیسے چمن میں پھول کھلا۔ کاشت کے لیے زمین نہ ضرورت سے زیادہ زرخیز ہو اور نہ بنجر۔ زیادہ زرخیز ہو تو پھول کے بجائے صرف پتے نکل آئیں گے۔ اگر زمین بنجر ہو تو کچھ نہیں اگے گا۔ دوسری شرط یہ

ہے کہ وہاں تخلیقی دماغ موجود ہو۔ چمن کے لیے صرف موزوں زمین کا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اچھا مالی بھی چاہیے۔ چمن میں پھول اسی وقت کھلیں گے جب کہ وہ بیج بوئے گا، پانی دے گا، حفاظت سے نشوونما کرے گا۔ یہی حال معاشرہ کا ہے۔ جب تک ہمارے حالات موزوں نہیں ہوتے قوم سدھر نہیں سکتی ہے

"نہ مجبور بندہ نہ مختار ہے — میانہ روی یاں سزاوار ہے"

بلند تہذیب و ترقی و خوشحالی جاپان یا جرمنی یا امریکہ کی دولت پر منحصر نہیں یا انسان کے کردار پر ہے

"مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانیؓ"

ضرورت اس بات کی ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے ماحول کو درست کر لیں۔ ذرا غور کیجیے ہمارے آس پاس کتنی گندگی ہے۔ ہم میں ہر قسم کا عیب موجود ہے۔ دھوکہ، فریب، خود پرستی، سستی، جہالت، جھگڑا، نفاق، غرض ہر وہ کمزوری جو ایامِ جہالت میں موجود تھی دوبارہ ہمارے معاشرہ میں پھیل گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ واقعے کے اطراف چکر لگاتی ہے اور بار بار اسی مرکز پہ آ جاتی ہے جہاں سے وہ نکلی تھی۔ ہم ایامِ جہالت کے رستے پھر آ گئے ہیں۔ وہاں سے نکلنے کے لیے اسی کشتی پہ سوار ہونا ہوگا جو رسول اکرمؐ نے ہمیں بخشی ہے

"پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا"

"یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں — کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"

معاشرے کی بہبودی اسی میں مضمر ہے کہ ہم آپس کے اختلافات کو ختم کر کے پیار کا مظاہرہ کریں

"لگایا تھا مالی نے ایک باغ ایسا — نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا"

"کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی — زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی"

اسلام اخوت و مساوات کا علمبردار تھا۔ ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے ہوتے تھے، بندہ و صاحب و محتاج و غنی سب ایک تھے۔ آج کا نقشہ دیکھیے۔ مساوات کی روح کو پھر سے تازہ کرنا ہوگا۔ مالداروں کو غریبوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ پڑھے لکھے بھائی ان پڑھ بھائیوں کو علم کی روشنی سے نوازیں گے ہمارے علماء و فضلاء [illegible]

مولوی قاضی صاحب اونچے طبقہ کو کچھ دوسروں کا خیال رکھنا ہوگا ۔

"ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں — درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں"

یہ درد بازاروں میں نہیں بکتا۔ ہر شخص کے دل میں موجود ہے۔ تھوڑی سی چوٹ ہمیں لگے تو بلبلا اٹھتے ہیں۔ اور دل پر غم کے پہاڑ ٹوٹیں تو ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ عزت و عظمت قربانی سے خریدی جاتی ہے ۔

"برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی"

اس لیے سب سے پہلے ہمیں یہ شعور چاہیے کہ انسانیت ایک ہے۔ معاشرے میں ایک ہماری کوئی ہستی نہیں۔ جو ڈالی شجر سے ٹوٹ جاتی ہے، وہ بہار کی امید نہیں رکھ سکتی ۔

"ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

چونکہ اس مضمون میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور مسلمان اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اسلامی تعلیمات، تہذیب اور تاریخ سے یہاں زیادہ سہارا لیا جا رہا ہے تاکہ یہ ذہن نشین ہو جائے ۔

"کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں"

اب سوال یہ ہے کہ ہماری سماجی حالت کیسے بہتر ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ نظام زندگی کا جو نقشہ رسول اکرم نے ہمیں عطا کیا ہے اس کو بدل جائے اور دوسروں کی تقلید کی جائے جو بام عروج پر آج پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا نظام حیات بھی ایک زمانے میں بہترین تھا۔ اس کے اصول پر نہ چلنے کی وجہ سے ہمیں آج تکلیف پہنچ رہی ہے۔ اگر اس کی اصلاح ہو تو ہماری زندگی اب بھی بہتر ہو سکتی ہے۔ یہاں ہماری صرف چند خامیوں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جو اصلاح طلب ہیں۔ ہماری فضول خرچی کو لیجیے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ایسا دل کھول کر ہم پیسہ خرچ کیا کرتے ہیں کہ گویا ہم بھی نواب زادہ یا بادشاہ سے کم نہیں۔ دعوتوں میں ہزاروں روپیوں کا سرمایہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے۔ زیورات کا انبار لگتا ہے۔ کپڑوں کا بازار سجایا جاتا ہے۔ یہ حالت مالدار طبقہ کی ہی نہیں بلکہ غریب لوگ بھی ان کے دیکھا دیکھی فضول خرچی پر اتر آتے ہیں۔ پیسہ نہ ہو تو قرض لیتے ہیں۔ اپنا مکان یا جائداد رہن رکھ کر یا فروخت کر کے تین روز جشن میں زندگی کا سارا سرمایہ لٹا دیتے ہیں۔ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ چودہ سو سال قبل اس قسم کا رواج تھا اسے منع کیا ہے اس پر غور کرنا ہوگا۔ رسول اکرم

اپنی بھتیجی صاحبزادی بی بی فاطمہ کی شادی کیسے سیدھی سادی تھی اور کیا جہیز دیا تھا اس کو یاد رکھنا ہوگا۔ ضروری اور غیر ضروری اخراجات میں فرق کرنا ہوگا۔ اگر رقم دکھاوے پر چاندی کی شکل میں یا سرمایہ کی صورت میں نادار کو دے دی جاتے تو شاید اس کا مستقبل بہتر ہو جائے اس کے کئی رنگیلی فالتو ناچ گانا اور دیگر واہیات طریقے محنت سے کمائی ہوئی دولت کو برباد کیا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر کسی نیک کام جیسے غریب کی امداد یا مریض کی شفا یا یتیم کی پرورش یا مدرسہ کا افتتاح یا مسجد کی تعمیر وغیرہ کے لیے درخواست کی جائے تو ایسے بہانے تراشے جاتے ہیں کہ مانگنے والے کو ترس آجاتا ہے اور شاید مجبوریوں کی داستان سن کر وہ خود اپنی جیب خالی کرنے پر راضی ہو جاتے۔ ہمارے دیگر غیر مسلم بھائیوں میں شادی بیاہ کی اصلاح ہو رہی ہے۔ شاندار شامیانوں کی بجائے مندر اور کلیسا میں شادیاں ہو رہی ہیں۔ ہم اپنی مسجدوں کے صحنوں کو بھول گئے ہیں جہاں پر از روئے سادگی کی ایجاب و قبول ایک جگہ ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں نے تو اب (MASS MARRIAGE) یعنی شادیاں اکٹھے منانے کا رواج شروع کیا ہے جس میں صرف نکاح ایجاب و قبول کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دس بیس تیس نکاح ایک وقت اور چند لمحوں میں نہ دعوت نہ زیور نہ کپڑا۔ شادی خوشی کو کہتے ہیں یا مل بیٹھنے کو کہتے ہیں ضروری کا اسلامی طریقے سے ایجاب و قبول کے فرائض کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ باقی سارے لوازمات غیر ضروری ہیں۔ ہم اس اسراف کو روک سکیں تو بہتر ہوگا۔

صرف شادی بیاہ میں ہی نہیں زندگی کے ہر شعبہ میں فضول خرچی ہمارا شعار بن گیا ہے۔ سادگی نام کو نہیں۔ ہمارا طور طریقہ رہن سہن عادات اطوار سوچ بچار سب کچھ ایسے ڈھانچے میں ڈھل گئے ہیں جو صرف تنزل کی ابتدا ہے ترقی کی نہیں۔ کسی شخص کو خیال نہیں کہ آمدنی سے خرچ زیادہ ہو تو مصیبت نازل ہوتی ہے۔ بیوی کا اصرار ہے کہ شوہر اس کی ہر خواہش پوری کرے گو کہ شوہر میں سکت ہو نہ ہو بیوی نہیں سوچتی کہ پیسے کہاں سے آئیں گے شوہر ہمیشہ مقروض اور لعنت زدہ ہی رہنا چاہئے گا۔ وہ یہ نہیں سوچے گا کہ قرض ذہنی صحت کے لیے مضر ہے۔ لکھنؤ کا دستر خوان اور دہلی کے ذائقے کی صحت کا پیغام لے آیا۔ جس نے منہ کے مزے چکھا سور کی دال پہ دولت لٹائی وہ فوراً معدہ کا   کیسے حاصل کرے؟ جس قوم نے "کہ ہے نان شعیر پہ مدار قوت حیدری" کا سبق دیا تھا وہ کو نہ دیکھا ہے کہ

اپنی قوت صرف کر رہا ہے۔ معمولات سے ہٹ کر ایک اور سالن کے پکانے پر حضرت عمرؓ اپنی بیوی پر برس پڑے تھے۔ صحت کا معیار تنگی و بھوک کی طلب ہے۔ صرف کھانا پینا ہی نہیں زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں سے زیادہ شاید ہی کوئی اور قوم ہو جو گنے قدم چلتی ہو جو کرنا ہو وہ ہم نہیں کرتے۔ جو نہیں کرنا ہے وہ ضرور کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اس بے راہ روی کو چھوڑ کر ایسے اصول اختیار کریں جس میں ہماری بہبودی موجود ہو۔

اسراف و فضول خرچی کے علاوہ جو دوسری کمزوری ہمارے معاشرے کی جڑ کھوکھلی کر رہی ہے وہ ہماری آپس کی نا اتفاقی ہے۔ جس تہذیب کی بنا اتحاد پر تھی وہ آپس کی نا اتفاقی، فرقہ وارانہ ذہنیت اور نفاق و فساد کے مہلکانہ مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ایام جہالت کا نقشہ پھر سے نظروں کے سامنے آرہا ہے ؎

"کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا — کہیں آگے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں — یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں"

آج بھائی بھائی کا دشمن ہے۔ زر، زن، زمین کے علاوہ معمولی سی حرکت پر بھی ملال کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، آپس میں الفت، انسانیت کا احترام وغیرہ اوصاف حمیدہ کو چھوڑ کر ایسی غیر سلامانہ حرکات ہم اختیار کر رہے ہیں جس کا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی ساری قوت دوسروں کو نقصان اور شر پہنچانے میں صرف کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کیکڑوں کی ٹوکری کے لیے ڈھکن ضروری نہیں۔ اگر ایک کیکڑا ٹوکری سے نکلنے کی کوشش کرے تو ضرور دوسرا اس کے پیچھے کھینچ کر پھر سے ٹوکری میں ڈال دے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص بھی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کی کوشش کرے گا تو ضرور دوسرا اس کے قدم توڑے گا۔

ایران عراق کی جنگ کو لیجیے کہ کیسے ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا بنا۔ پاکستان مسلمانوں کی انفرادیت کی مانگ پر حاصل کیا گیا جو چند سال بھی قائم نہ رہا۔ بنگلہ دیش کا قیام ایک اصول کی موت تھی۔ ہمارے فلسطینی بھائی آج در بدر مارے مارے دنیا کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اور خود ان کے آپس کے اتنے فرقے ہیں جتنے ایک درخت کے مختلف پتے۔ اسلام عرب سے نکلا اور ساری انسانیت کو ایک متحد خاندان کی تشکیل دینے میں ایک حد تک کامیاب رہا۔ لیکن آج وہی عرب

قوم پھول کی بکھری پنکھڑیوں کی طرح الگ الگ ہو چکی ہے۔ سیاست سے دور،
زندگی کے ہر شعبے کا یہی حال ہے۔ مسلمانوں کے اتحاد کا سبق صرف کتابوں میں لکھا گیا
ہے۔ عمل میں اس کا کچھ نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا حال تو عجیب ہے۔ جنگل کے
کوئی ایک کھاتا پیتا نظر آجاتے تو دوسرے، سمجھتے ہیں یہ وہاں کیوں ہو سکتے ہیں۔
ان میں کیسے اتفاق پیدا کیا جائے ان کو کیسے متحد و منظم کیا جائے اور ان کو کیسے
ایک مرکز پہ لایا جائے یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ اس پہ ہمارے قائد، حکماء، فضلاء، مولوی اور
ہمارے پڑھے لکھے طبقہ کو غور کرنا چاہیے اور ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ مسجدوں کے
خطیب جنت دوزخ کے قصے سنانے کے بجائے اتفاق و اتحاد کی فضیلت بیان
کریں تو بہتر ہو۔ مدرسوں میں درس کی کتابوں میں افسانے و کہانیوں کو ادب کی ترویج
قرار دینے کے بجائے اخلاقی مضامین کو ترجیح دیں تو بہتر ہو۔ اپنے اپنے گھروں میں ماں
باپ بچوں کے سامنے لڑنے جھگڑنے کا مظاہرہ چھوڑ دیں تو بہتر ہو۔ نوجوان اپنا خالی
وقت گپ شپ میں ضائع کرنے کے بجائے کسی اچھے کھیل جیسے کرکٹ، ہاکی، فٹ بال
وغیرہ میں جہاں کا میدانی اتفاق پر منحصر ہے لگا دیں تو بہتر ہو۔ ہمارے اخبارات، رسالے
اور جریدے دوسروں کی کمزوریاں تلاش کرنے کے بجائے ایک دوسرے کو جوڑنے کی
ہمواری پر توجہ دیں تو بہتر ہو۔ ہمارے قائد اور لیڈر صرف اپنے مفاد پر نظر رکھنے اور ایک
دوسرے پہ کیچڑ اچھالنے کے بجائے دوسروں کی خدمت کو نصب العین بنائیں تو بہتر ہو۔
ہمارے افسر، انجینئر، ڈاکٹر، لائر، پروفیسر وغیرہ دوسروں کی قابلیت کا احترام کرنا بھی سیکھ
جائیں تو بہتر ہو۔ ہمارے کاشتکار، تاجر، کاریگر ایک دوسرے کی مدد کرنا قبول کریں
تو بہتر ہو۔ امریکہ کے کاشتکار والے کے پاس دو دو ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ زمین ہوتی ہے
جو صرف ایک کاشتکار سنبھالتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ غیر حاضر ہو تو اس کا سارا کام اس
کے ہمسایہ کے سپرد ہوتا ہے۔ جو غیر کی زمین کا کام اپنی زمین کے کام سے بھی زیادہ اہم
سمجھتا ہے۔ اگر کوئی امریکی ایک سال سے زیادہ مدت کے لیے بھی باہر چلا جاتا ہو تو اپنے
گھر والوں کا تو ان غیر کے ہاتھ دے جاتا ہے۔ کیا مجال کہ اس کے گھر کا تنکا بھی اپنی جگہ سے ہٹے۔
ایک دوسرے پہ اعتماد، خلوص، بھائی چارگی کوئی ان سے سیکھے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ
او خشت رسے او خشت تیری گور نہ بھی گل سیاہ گی۔

صرف فضول خرچی و بیماری نااتفاقی ہی ہماری کمزوریاں نہیں بلکہ ہر قسم کی اخلاقی پستی کا بازار ہمارے ہاں گرم ہے۔ جھوٹ بولنا فیشن سمجھا جاتا ہے۔ دھوکہ و فریب کمال عروج پر پہنچا ہے۔ آتش مزاجی ہمارا شعور ہے۔ سستی سستی زبردستی کا جھنڈا ہر جگہ بلند ہے۔ محنت و مشقت سے دشمنی کمسنی میں پڑی ہے۔ وقت کی قدر و منزلت نہ کرنا ہمارا شیوہ بن گیا ہے بحث و تکرار رہنا انسانی جسم کے اعضاء بن چکے ہیں۔ ہمارا شمار کالے بازار کے سرداروں میں گنا جاتا ہے۔ غنڈوں کی صف اولین میں لیا جاتا ہے۔ اچھے خاصے انسان ہمارے کرتوت دیکھ کر شرما جاتے ہیں۔ پستی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ہم وہاں سے بھی گذر چکے ہیں غلطی سے کوئی بھلا آدمی مل جاتا ہو تو اس کو یہ سرٹیفیکیٹ ملے گا کہ وہ پچھلے جنم میں برہمن تھا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری سماجی اصلاح جلد ہو۔

پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اخلاقی کمزوریوں کی اصلاح کیسے ہو۔ شاید مسلمانوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے سے ہماری اصلاح ہو۔ ہم میں جتنی بھی برائیاں ہوں ایک خوبی ضرور ہے۔ وہ جرأت۔ جرأت کا تعلق دل سے ہے۔ بے کھٹکے کام کرنے کا نام جرأت ہے جرأت دو قسم کی ہے۔ جسمانی جرأت اور اخلاقی جرأت میدان جنگ میں ہماری جسمانی جرأت کا ذکر تاریخ کے ہر صفحے پر ملے گا۔ آج جسمانی جرأت سے زیادہ اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔ اخلاقی جرأت ایمانداری و درست بازی کا نام ہے۔ اپنے فرض کو بخوبی انجام دینے کا نام اخلاقی جرأت ہے۔ اخلاقی جرأت حاصل کرنے کا طریقہ اپنے نفس کی شرارتوں کو دبانے میں مضمر ہے چونکہ مسلمان اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ ہر مسلمان کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اس کے ہر کام کا شاہد مالک حقیقی ہے۔ مسلمان کو دنیا کی کسی طاقت سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں لیکن خوف خدا ضرور ہے۔ جو انسان صرف اللہ سے ڈرتا ہے جو کام بھی وہ کرے جو بات بھی وہ کہے اس سے پہلے یہ خیال رہے کہ اس میں اللہ کی خوشنودی موجود ہے یا نہیں۔ وہ اپنے دل سے پوچھے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے یا کہنا چاہتا ہو وہ اللہ کے حکم کے مطابق درست ہے بھی یا نہیں اگر درست ہو تو لوگوں کی مخالفت کے باوجود وہ کام کرے اور وہ بات کہے۔ صرف یہ خیال ہمیشہ رہے کہ وہ کام اور وہ بات ایمانداری پر مبنی ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ اس پستی کے عالم میں بھی ہماری اصلاح صحیح مذہبی رہنمائی سے ہی ہوگی۔ آج بھی مسلمان اسلام کے نام پر جان دینے کے لیے تیار ہے۔ مسلمانوں [illegible]

وطن پر اگر پابندی نہ لگ جاتی تو خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ اس لیے اپنے مذہب کا سہارا لیکر اپنے آقا کی تعلیم کو پھیلاکر اپنی تاریخ کے سنہری اوراق دہرا کر اور اپنے ایمان کا وسیلہ دے کر اگر اچھی طرح ہم اپنے بھائیوں کو سمجھا دیں اور ہم خود بھی راہ راست پر آجائیں۔ تو رحمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ وہ ضرور ہماری حالت بدل دے گا۔

مسلمانوں کی اقتصادی حالت کیسے بہتر بنائی جا سکتی ہے

انسانوں میں جب شعور آیا تو دل و دماغ کو اہمیت دی گئی۔ ارسطو و افلاطون و دیگر حکماء نے علم و عقل کو جو دماغی سرمایہ ہے انسانوں کا جوہر سمجھا۔ کچھ زمانہ بعد روحانیت کو جس کا دل سے رابطہ ہے۔ انسانی عروج کی معراج مانا گیا ہادی و رسول انبیاء و اولیاء نے دل کی صفائی کو مالک حقیقی کا آئینہ تصور کیا۔ دین اسلام بھی اسی ڈھانچے میں ڈھلتا گیا۔ زمانہ گذرتا گیا اور خیالات بدلتے گئے حتیٰ کہ بیسویں صدی کے وسط میں ایک مفکر کارل مارکس نے دل و دماغ سے نیچے اتر کر پیٹ کو انسان کی ساری کوششوں کا واحد مرکز قرار دیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور مفکر سگمنڈ فرائڈ نے (SIGMUND FREUD) پیٹ سے بھی نیچے اتر کر جنسی خواہشات کو تہذیب و ترقی کا اہم سبب بتایا۔ اس مضمون میں بحث ارسطو، افلاطون، انبیاء، اولیاء یا سگمنڈ فرائڈ سے نہیں بلکہ کارل مارکس سے ہے۔ جس کے اصول مسلمان نہ سمجھنے کی وجہ سے آج غربت میں ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ اس مضمون کا مقصد کمیونزم کی ترویج نہیں بلکہ صرف اس حقیقت کو اجاگر کرنا ہے کہ معاشی و اقتصادی حالت بہتر بنائے بغیر مسلمان عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہماری حالت کیسے سدھر سکتی ہے؟ جواب آسان ہے ہماری حالت پہلے بہتر تھی کیسے بہتر تھی اس پر غور کرنا ہوگا۔ اسلامی تاریخ بتاتی ہے ـــ

نبوت سے رہا ان کا گرما گیا جب ـــ مسلمان پہ توحید کا چھا گیا جب
سکھاتے مشیت کے آداب ان کو ـــ پڑھاتے تمدن کے سب باب ان کو
جتاتی نہیں وقت کی قدر و قیمت ـــ دلاتی انہیں کام کی حرص و رغبت

کارل مارکس سے صدیوں قبل اسلامی تعلیم میں معیشت کے آداب موجود ہیں۔
کسی نے سچ کہا ہے کہ مغربی تہذیب کا مدار شہر میکینکی گھڑی MECHANICAL CLOCK
اس سے مشینیں مقصود نہیں بلکہ وقت کی قدر و قیمت کا احساس۔ مغرب میں چوری کرنا
اتنا بڑا نہیں سمجھا جاتا جتنا کہ وقت کی پابندی توڑنا۔ اگر لندن سے پیرس جانے والی ریل
(GOLDEN ARROW) دو منٹ بھی دیر کر دے تو انگلستان کا مایہ ناز اخبار "ٹائمز"
اپنے پہلے صفحہ پر موٹے حروف سے ریلوے کے عملے پر حملہ کر دے گا۔
چرچل کابینہ کے ممبر کی دو منٹ کی دیر کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا گوئٹے
نے کہا تھا کہ موجودہ لمحہ زبردست کارساز حقیقی ہے THE PRESENT MOMENT
IS A POWERFUL DIETY اسلامی تہذیب کا سارا مدار وقت کی پابندی
سے منسلک ہے۔ اوقات نماز روزے کی سحری و افطار ایام حج صدقہ، زکوٰۃ، قربانی
اور زندگی کے دیگر امور کب کیسے، در کس وقت ادا کرنا۔ سب درج ہیں۔ اس نقشہ کو
آج کے حالات سے آزمایا جائے تو پتہ چلے گا کہ وقت کے احساس کی کس قدر کمی ہو چکی
ہے۔ ہم کونسا کام وقت پر کر رہے ہیں۔ سوائے کھانے پینے اور سونے کے؟ جو کام جتنا
وقت لیتا ہے اس کو خوبی سے انجام دینا وقت کی پابندی ہے۔ یہ اگر ہم سیکھ جائیں تو
معیشت کے آداب کا پہلا حرف بھی سمجھ میں آجائے گا۔

وقت کی پابندی سے لگا ہوا دوسرا لفظ کام کی حرص اور رغبت ہے۔ ہماری سستی
و غفلت شعاری دور کی جاتے تو ہماری غربت بھی بٹ جاتی تھی۔ ٹالسٹائی نے صحیح کہا
تھا کہ وہ زمانہ دور نہیں جبکہ لوگوں کو کھانا اُن کے ہاتھوں کو دیکھ کر دیا جائے گا اگر
ہاتھ مضبوط و سخت ہوں تو انہیں لقمۂ تر ملے گا۔ اگر ہاتھ نرم ہوں تو انہیں دسترخوان
کی بس ہڈی ملے گی۔ مطلب یہ کہ جو کام نہ کرے، دوسروں پہ بوجھ ہے" محنت و مشقت
سے جی چراتے اور آتش مزاجی سے کام لے تو اس کو بہت جلد خاک ہونا پڑے گا۔
"بن آتے گی ہر گھڑیاں کچھ سے یوں — جو کچھ کاٹا ہو تو بونا پڑے گا"
امریکہ ہو یا روس یا فرانس ہو یا انگلستان یا جاپان ہو یا جرمنی۔ سبھی مہذب اقوام
صرف محنت و کاوش کی وجہ آسمان عروج پر پہنچ گئے ہیں۔ اور غریب مسلمان روٹی کو
ترس رہے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں رات کے کسی حصہ میں بھی لوگ کام کرتے دیکھے جاتے ہیں

گے۔ اور ہم یہاں دن کے بھی کسی حصہ میں سوتے پائے جائیں گے۔

باتیں تو ہم بہت کرتے ہیں لیکن کام بہت کم ہے

"کاش کہ تم نے حالی دریا بھی گرہ لیا۔ یہ تو بتائیں حضرت کہ کچھ کر کے بھی دکھایا"

کچھ کر کے دکھانا ہمارا شیوہ نہیں۔ نیلسن نے مرنے سے پہلے ایک جملہ کہا تھا جو انگلستان کے ہر بچہ کو یاد ہے "ہر شخص سے انگلستان یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کیا۔" یہ کہتے ہوئے نیلسن نے جان دے دی۔

ENGLAND EXPECTS EVERYMEN, TODO)

HIS DUTY, THANK GOD I DID MINE

ہم اپنے دل کو ٹٹولیں اور یہ پوچھیں کہ کس حد تک یہ جملہ ہم پر صادق آتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ ہماری حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خوشی سستی کی لوٹ میں دیکھی نہیں جاتی۔ HAPPINESS IS OUT OF THE REACH OF LAZINESS

مسرت و شادمانی صرف محنت و مشقت کے پھل ہیں۔ انسان کی قدر و منزلت اس کے عمل پر منحصر ہے۔ قرآن میں عمل صالح کا ذکر صوم و صلوٰۃ سے کہیں زیادہ ہے۔ انسان اسی وقت فطرت کا نادر نمونہ سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے کسی چیز کو حاصل کرتا ہے۔ (A MAN IS A MIRACLE OF GENIUS, BECAUSE HE IS A MIRACLE OF LABOUR) اگر مسلمان اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو ان کی غربت آن واحد میں غائب ہو جائے گی۔ ایک زمانہ تھا جبکہ ہم نے

"دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے — بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"

اور آج یہ ہے کہ

"کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے — ہم سے کب پیار ہے ہاں نیند تمہیں پیاری ہے"

ہماری خوشحالی کا نسخہ کام سے لگن میں مضمر ہے۔ کوشش، عمل پیہم، مستعدی، حوصلہ وسلیقہ ہماری خوشحالی کی ضامن ہیں۔ آئیے اس ضمانت سے پورا فائدہ اٹھائیں

وقت کی قدر و منزلت اور کام سے گرمی و رغبت کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ وقت اور کام کا رشتہ کیسے مضبوط ہو، کون سا کام کب ہو اور کیسے ہو۔ قدرت کا عطیہ ہے کہ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ صلاحیت موجود ہے۔ اس صلاحیت کو سمجھنا بہت ضروری

ہے۔ ہر شخص مدبر، مفکر، محقق، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل وغیرہ نہیں ہو سکتا اور یہ ضروری بھی نہیں۔ ضرورت صرف نیک اور خوش حال انسان کی ہے۔ نیکی اور خوشحالی کسی کام کو بھی خوش اسلوبی سے انجام دینے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ صدر امریکہ جان ایف کینیڈی کو اپنے باپ سے ایک نصیحت ملی تھی۔

"بیٹا تم کچھ بھی بننا چاہتے ہو، چاہے نالی کھودنے والا ہی سہی لیکن اس میدان میں بھی یکتا ہو"

BE WHATEVER YOU WANT TO BE, EVEN A DITCH DIGGER, BUT BE THE COST DITCH DIGGER IN THE WORLD

اس سبق کو یاد رکھتے ہوئے اور اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہوئے جان ایف کینیڈی اپنے ملک کے صدر اعظم بن بیٹھے۔ اس لیے ہمیں یہ نہ سوچنا چاہیے کہ یہ کام چھوٹا ہے اس لیے میں نہیں کروں گا۔ وہ کام بڑا ہے مجھ سے نہ ہوگا۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی جو اچھی طرح انجام دے گا وہ بڑے سے بڑا کام بھی کر سکے گا۔ ہر منزل پہلے قدم سے ہی شروع ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا درخت بھی ننھے بیج کا ہی محتاج تھا۔ ضرورت مسلسل کوشش و کاوش کی ہے۔ رغبت و محنت کی ہے اور صحیح طور طریقہ کی ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمان کیا کام کر سکتے ہیں۔ یہ سوچنا ہوگا۔ ذرائع معاش ہندی کے کہاوت کے مطابق تین ہیں "اُتم کھیتی مدھم بیوپار، نکھد چاکری"۔ زراعت، تجارت اور ملازمت کے علاوہ صنعت و حرفت کا ایک چوتھا پیشہ بھی ہے جس سے انسان خوشحالی اور فارغ البالی خرید سکتا ہے۔ زمانہ دراز سے ہندوستان میں زراعت کو بہترین پیشہ سمجھا گیا ہے۔ زمین سونا اگلتی ہے محنت سے کھیت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ کسان کی محنت کا صلہ اور اس کی تھکان کا معاوضہ لہلہاتے کھیت ہیں جنہیں دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔

ایک چینی محاورہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک شب کی خوشی مانگتا ہو تو وہ اس کو شراب میں ملے گی۔ ایک ہفتہ کی خوشی مقصود ہو تو شادی میں مضمر ہے۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کی خوشی چاہتا ہو تو اس کو باغ اگانا ہوگا جس کے پھول پتے، اور پھل مال و دولت کے علاوہ روحانی مسرت بھی بخشیں گے۔

مسلمانوں میں کاشت کار کم ہیں۔ زمین سخت محنت چاہتی ہے ہم اس کے عادی

۶۔ کیا زراعت ہمارا پیشہ نہیں رہا

"سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"

مسلمانوں کو اب بھی غرور ہے کہ وہ سات سو سال یہاں حکمراں رہے۔ اب بھی ان کا دماغ زمین کھود کر اناج اگانے پر راضی نہیں ہوتا۔ ان کے پاس زمین بھی نہیں۔ آزادی سے پہلے اتر پردیش میں چند زمیندار تھے۔ کافی مالدار لیکن سارے کے سب بے کاشتکار۔ جب بھی زمینداری ختم ہوئی تو زمین کاشتکار کو گئی۔ اور زمیندار خالی ہاتھ رہ گئے۔ لے دے کے صرف جنوب میں کیرالا میں چند مسلمان کاشتکار ہیں جو نسبتاً بہت خوشحال ہیں۔ یہ شکل تو دیگر صوبوں کی ہے۔ اور خاص کر اتر پردیش، مدھیہ پردیش بہار اور اڑیسہ میں جہاں مسلمانوں کی مالی حالت از حد خراب ہے۔ آج کل زمین آسانی سے خریدی بھی نہیں جا سکتی۔ موروثی زمین ہو تو علیحدہ بات ہے۔ ان کے جو مالک ہیں وہ محنت کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے زمین سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اور سرکاری قوانین کے مطابق خود کاشت نہ کرنے کی وجہ سے زمین کو کھو رہے ہیں۔

اس بات کا احساس ضروری ہے کہ ہم کاشتکاری کی اہمیت کو سمجھیں اور جن اصحاب کے پاس زمین ہو اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ آج کل نئے "نمونے کی کھاد" "بیج" زراعت کے کئی نئے طریقے، اناج کی بیماریوں کا علاج، اناج کے فروخت کی سہولت وغیرہ کی وجہ سے ہندوستان میں ہرا انقلاب آ رہا ہے۔ بینکوں سے قرضہ ملتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ یہی کاشت میں اضافہ کریں۔ نوکری یا پر منحصر کرنے کی بجائے خود دلچسپی لیں۔ شہروں کی گندگی میں پھنسنے کی بجائے دیہات کی پاکیزہ فضا میں کاشتکاری کا لطف حاصل کریں۔

دوسرا اہم پیشہ تجارت ہے۔ اسلام میں یہ پیشہ ممتاز ہے۔ رسول اکرم ﷺ تاجر تھے۔ یہ ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ ہر جگہ مسلمان چھوٹی موٹی تجارت کرتے پائے جاتے ہیں۔ لیکن بڑے پیمانے پر تجارت کے لیے ان کے پاس سرمایہ نہیں۔ چھوٹی موٹی تجارت سے صرف بال بچے زندہ رہ سکتے ہیں بلندی پر پہنچ نہیں سکتے۔ ترقی کی راہ مسدود نظر آتی ہے۔ شوق، ولولہ، امنگ، حوصلہ اور سلیقہ ہو تو ترقی ممکن ہے۔ ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں آج کل ایم۔ بی۔ اے کی بڑی مانگ ہے جو تجارت کے طریقے سکھاتی ہے۔ اس میں

مسلمان طلباء شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ آج کل سرکار کی طرف سے ایک نہیں سیکڑوں منصوبے ہیں جو غریبی ہٹانے کے سلسلے میں تیار کیے گئے ہیں۔ مسلمان اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ شاید وہ جانتے بھی نہ ہوں کہ وہ کیا منصوبے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ہمارے غریب بھائیوں کو بتلائے اور ان کی مدد کرے۔ تجارت بھی زراعت کی طرح محنت چاہتی ہے۔ جسمانی محنت سے بڑھ کر ہوشیاری، میل ملاپ، خوش اخلاقی، صداقت، شرافت۔ اگر دکاندار ناپ تول میں کمی نہ کرے۔ خوش اخلاقی سے پیش آئے، وعدہ پورا کرے۔ کھوٹا مال نہ دے، خرید کا مال مہیا کرے اور گاہک کی خوشی کو اپنا سرمایہ سمجھے تو مسلمان تاجر بھی گجراتی و سندھی بھائیوں کی طرح مالدار بن سکتے ہیں۔

تیسرا پیشہ صنعت و حرفت کا ہے۔ اس میں بھی ہم بہت پیچھے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام ہی میں کاریگروں کی کمی ہے۔ بڑے بڑے اخباروں میں اشتہارات سعودی عرب، مسقط، ابوظہبی، عراق، لیبیا وغیرہ اسلامی ممالک کی طرف سے کاریگروں اور ہنرمندوں کی ضرورت پر چھپتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عام طور پر مسلمان صنعت و حرفت میں کس قدر پیچھے ہیں۔ ایسے تو ہندوستان بھی آزادی سے قبل پوری صنعتی انقلاب سے (GREEN REVOLUTION) پورا فائدہ اٹھا نہ سکا تھا۔ لیکن اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں صنعت و حرفت کی ایسی ترقی ہوئی کہ آج ہمارا ملک ناز کر سکتا ہے کہ یہاں کے صنعتی ماہر دنیا کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ اگر امریکہ یا یورپ کو ایک یا دو لاکھ ماہروں کی ضرورت ہو تو ہم اُن کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ دو سو کے قریب یونیورسٹیوں میں ہر سال ہزاروں ماہر تیار ہو رہے ہیں اور ملک ترقی کر رہا ہے۔ ضرورت کی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو ہندوستان میں نہ بنتی ہو۔ ہوائی جہاز، ریل، موٹر، مشین، لوہے کے کارخانے، برقی قوت کے آلے، ایٹمی قوت سے بجلی کی پیداوار حتیٰ کہ راکٹ، ٹینکوں کو پھاڑنے کی خطرناک ٹیکنیک، سب کچھ ہم جانتے ہیں۔

روس کی جنگی طاقت اور امریکہ کی مالی قوت کے برابر نہ ہونے پر بھی ہم ان دونوں سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس ہنگامہ کی ترقی میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا

ہے۔ اور وہ کس قدر فیضیاب ہو رہے ہیں۔ اس پر غور کیا جائے تو مایوسی سے کہنا پڑیگا کہ ہم بدھو کے بدھو ہی رہے۔ شکوہ شکایت حکومت سے نہیں اپنوں سے ہے۔ ہماری بے پروائی سے ہے، ہماری جہالت سے ہے، ہماری لاعلمی سے ہے، ہماری کم شعوری سے ہے، قصور ہمارا ہے۔ ہمارے دیگر بھائی ترقی کی راہ پر رواں دواں ہیں ہم نے اپنا پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ نہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور نہ جانتے ہیں۔ نہ کوئی ہم سے کہتا ہے کہ عازم سفر ہو۔ نہ سفر کا خیال ہے، نہ ہمت ہے، نہ شوق ہے اور نہ رہبر۔ صنعتی ترقی دنیا میں اس قدر تیزی سے ہو رہی ہے کہ امریکہ کی سات فیصد آبادی آدھی دنیا کے لیے اناج اُگاتی ہے۔ سویڈن کے صرف دو فیصد لوگ ان کی تمام خوراک کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ جاپان کا صرف پندرہ فیصد ملک کا حصہ رہائش کے قابل ہے لیکن ان کی ترقی پر ساری دنیا انگشت بدنداں ہے۔ کسی بھی ملک کی خوشحالی وہاں کی صنعتی ترقی سے جانچی جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مسلمان بھی صنعت و حرفت میں حصہ لیں۔

آج کل ہماری سرکار بہت کوشاں ہے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ صنعت و حرفت کی طرف مائل ہو۔ اس کے لیے ان گنت سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ ان سہولتوں سے واقفیت اور اُن سے پورا فائدہ اٹھانا ہمارا کام ہے۔ ہمارے لیڈروں کا کام ہے۔ ہمارے نوجوانوں کا مستقبل صرف اسی وقت درخشاں ہوگا جب کہ ہم صنعتی ترقی میں دل کھول کر حصہ لیں۔

چوتھا پیشہ ملازمت کا ہے۔ مسلمان ملازم پیشہ تو ضرور ہیں لیکن صرف چپراسی، کلرک اور معمولی قسم کی نوکریوں کی حد تک۔ ان میں اعلیٰ عہدیدار بہت کم ہیں۔ آپ سروے کیجیے پتہ چلے گا کہ ان میں کتنے آئی۔ ایف۔ ایس، آئی پی۔ ایس، آئی۔ اے ایس اور اسی قسم کے اعلیٰ عہدہ دار موجود ہیں۔ ہماری آبادی کے تناسب سے از حد کم۔ ہر سال مقابلے کے امتحانوں میں کئی سو عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے جن میں مسلمان شاید ہی ایک دو گنے ہوں۔ ان امتحانات میں ہمارا داخلہ ہی نہیں ہوتا۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتا۔ ہمارے نوجوان محنت کرنا ہی نہیں جانتے۔ ہماری بھرتی فوج میں، پولیس میں، عدالتوں میں، اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں میں، تحقیقی و تفتیشی اداروں میں بہت کم ہے۔

ضرورت ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ ہر شعبہ میں ہمت و دل چسپی سے حصہ لے اور ہر محاذ کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ محنت و ہمت سے کیا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا؟ ارادہ و

کوشش کی کمی ہے۔ ہماری جمہوری حکومت اقلیتوں کو پورا حق دینے کے لیے تیار ہے۔ ان کو مانگنے والا بھی موجود نہیں۔ ان اعلیٰ عہدوں کے لیے قابلیت چاہیے۔ قابلیت و صلاحیت حصولِ علم سے مل سکتی ہے۔ ہمارے نوجوان فنی تعلیم میں زیادہ حصہ لیں۔ ہم میں انجینئر، ڈاکٹر، سائنسداں، محقق، مفکر بہت کم ہیں۔ ملازمت کا علم سے گہرا رشتہ ہے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے پر ہی اعلیٰ عہدہ ملے گا۔ وہ زمانہ گیا جبکہ اعلیٰ عہدے مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ اب کافی کڑا مقابلہ ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ آپ میں مقابلہ کی طاقت نہ ہو تو ہمت ہار دیں گے۔ اس کے لیے خوب تیاری چاہیے۔ شوق و ولولہ چاہیے اور کام کا سلیقہ چاہیے۔

ماں باپ کا فرض ہے کہ اپنے بچوں میں زیادہ دلچسپی لیں۔ ان کی صحیح رہبری کریں۔ انہیں صرف روٹی کپڑا اور مکان دینے پر قناعت نہ کریں بلکہ ان کے مستقبل کو ہر لحاظ سے درخشاں بنانے کی کوشش کریں۔ نوجوانوں کو بھی چاہیے کہ وقت کی نزاکت اور اپنی حالت پر غور کریں۔ ہمارے لیڈر و پڑھے لکھے بھائی ہونہار نوجوانوں کی مدد کریں۔ ایک آئی اے ایس بھی قوم کے لیے باعث فخر ہے گا۔ معمولی ملازمتوں کی طرف نہیں بلکہ عزت کے درجوں پر نظر رکھیں اور انہیں حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

آخر میں یہی کہنا پڑے گا کہ ہماری حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم میں بہتر ہونے کا احساس پیدا نہ ہوگا۔

"عقل ہی رہنما جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ـــ نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں"

عزت کی زندگی بسر کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

"زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی"

لیکن ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ فرہاد جیسا کام پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر لانا آپ کے سپرد نہیں۔ ہم آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ قدر و منزلت ہو۔ محنت و مشقت سے رغبت ہو۔ صنعت و حرفت سے محبت ہو۔ علم و ہنر سے محبت ہو۔ زراعت و تجارت میں لگن ہو تو آپ کی غریبی خود بخود دور ہو جائے گی۔ اس کے لیے قلب سلیم چاہیے۔ مضبوط ارادہ چاہیے۔ مسلسل کوشش چاہیے۔ قدرت و فکر و عمل چاہیے۔ جس سے سنگ خارا بھی لعل نایاب بن جاتے ہیں۔ ضرورت صرف عمل اور عمل کی ہے۔ جیسا یاد رکھنا چاہیے "یقین محکم عمل پیہم ... [illegible]"

ہمیں سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا

بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے کہ فکرِ صحیح کی محرومی سے جو عذاب الٰہی قوموں پر نازل ہوتا ہے وہ برق و باراں سے زیادہ ہولناک ہوتا ہے۔ آدمؑ سے کہا گیا تھا کہ خلد میں جو چاہو کرو لیکن ایک ممنوعہ پھل چکھنے کا خیال کبھی نہ کرنا۔ آدمؑ کا دماغ حوا کی وجہ سے اظہار حکم عدولی پر راضی ہو ہی گیا۔ جس کا خمیازہ آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔ جب تک ہمارے سوچنے کا انداز عقل و شعور پر مبنی نہ ہو نتیجہ تباہ ہے۔ عموماً ہمارے سوچنے کے چار طریقے ہیں۔ جن میں اول تین طریقوں سے ہماری مصیبت دور ہو سکتی ہے۔ لیکن چوتھے طریقے سے بربادی لازمی ہو جاتی ہے۔ پہلا طریقہ تو انسان کا وہ تخلیقی مادہ ہے جو کسی کے بولے بتائے بغیر صحیح لائحہ عمل در پیش اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرا وہ جو دوسروں کے پہلے حرکات و سکنات دیکھ کر ان سے سبق سیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ تیسرا وہ جو پھسل کر سنبھل جاتا ہے اور اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر راہ راست پر آجاتا ہے۔ ان تینوں قسم کے دماغ سے فلاح و بہبود کی کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ لیکن چوتھے قسم کے دماغ سے جو نہ خود صحیح سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور نہ دوسروں کی فکر صحیح کو تسلیم کرتا ہو۔ ورنہ خود اپنے تجربوں سے کچھ سیکھتا ہو۔ کبھی یہ امید نہ ہوسکے گی کہ اس کا خشک دماغ بار آور ہوگا۔

برسے اگر گھٹا آسماں سے آکر — کہاں تو گے شاخ بید سے ثمر

ہمیں افسوس سے کہنا پڑے گا کہ عالم اسلام میں پہلے تین قسم کے دماغوں کا فقدان ہے۔ ہر لکھنے والا ہماری کمزوریوں کا راگ شد و مد سے الاپتا ہے۔ لیکن ان کی اصلاح کی تدبیروں کا ذکر کچھ کم ہی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے سوچنے کا انداز کیا ہو؟ یہ ہمیں ہر جگہ بتایا گیا ہے۔ اگر ہمارا دماغ عقل و شعور کے تثلیث کے تین محور پر لگ جاتے تو ہم میدان

جیت سکتے ہیں۔ یہ تین مرکز ہیں۔ خدا بینی، خود بینی اور جہاں بینی۔ مالکِ حقیقی کی پہچان توحید پر ہے۔ ہر شخص کے لیے شاید مشکل ہو کہ ذاتِ الٰہی کی ہر صفت پر کافی عبور حاصل کر سکے۔ لیکن بآسانی سمجھ میں آجانے والی ایسی ہزاروں صفات ہیں جن پر نظر پڑے تو بہتر ہے۔ مثلاً مالک کا رحم و کرم، فضل و عنایت، کمال و جمال، قدرت و ندرت، تخلیق و توسیع، عرفان و ایقان، عظمت و شان، علم و حکمت اور دیگر ان گنت خوبیوں کی خوشبو زمانہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ چند لمحے خالق کی قدرت پر اگر ہم صرف کر سکیں تو چاروں طبق روشن ہو جائیں گے۔ ہمارے صحیفۂ پاک میں آیا ہے کہ سارے سمندروں کا پانی سیاہی بن جائے اور سارے درختوں کی لکڑی قلم بن جائے اور صفاتِ الٰہی لکھے جائیں تو نہ سیاہی کافی ہوگی اور نہ وہ قلم۔ حافظؔ نے کیا کیا خوب کہا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اس ایک شعر پہ باٹنی کی (BOTANY) کتنی جلدیں لکھی جا سکتی ہیں۔ جو صاحب نظر ہو اس کے سامنے ہرے درختوں کا ہر پتہ ایک دفتر ہے جو کارسازِ حقیقی کے عرفان کا شاہد ہے۔ ہمارے بچے اب اسکولوں میں پڑھتے ہیں کہ درخت کے ہرے پتے نہ ہوں تو ہمارے آکسیجن کا اسٹاک کم ہو جاتا ہے۔ سورج کی شعاعوں کے اثر سے کیمیائی طاقت پتوں میں آجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے سانس کی گندی ہوا ان نباتات کے طفیل پاک ہوا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیا یہ قدرت کا کرشمہ نہیں ہوگا؟ ہری گھاس گائے چرتی ہے اور گؤ امرت والا دودھ بخشتی ہے۔ کیا یہ تخلیق کا معجزہ نہیں؟ ادنیٰ سا بیج کی صورت میں ہم بوتے ہیں کل وہ پھل دار رنگا رنگ درخت کے روپ میں ہمیں میٹھے میوے عطا کرتا ہے۔ کیا یہ ربوبیت کا احسان نہیں؟ اور یہیں کائنات کا انکشاف، ATOMIC RESEARCH) اور بجلی کی قوت؟ کیا یہ حیرت کا مقام نہیں؟ تو ہمارا دھیان کیوں نہیں اس طرف رجوع نہیں ہوتا جہاں قدرت کی فیاضی کی انتہا نہیں؟ سامانِ دنیا کے علائق ترک کر کے چند لمحے مالکِ حقیقی کے فضل و کرم پر غور کرنے سے ہم مزید سرخرو ہو سکیں گے اگر ہمارے سوچنے کا یہ ڈھنگ ہو ؎

جنگل میں اگر ادھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

تو کیا خوب ہو جب انسان کے سوچنے سمجھنے کا مرکز قدرت ہی ہو تو ہمارا کام بن گیا

کا احساس غیر ضروری خیالات کے مضر اثرات سے بچائے رکھے گا۔ کائنات کا وجود اس کا تناسب، اس کا ربط و ضبط، ہم آہنگی، تخلیقی مادہ اور دیگر ان گنت نکات و صفات سے نظامِ حیات میں زندگی کی جو لہر دوڑ رہی ہے اس کی حیرت انگیز کارگزاری پر توجہ مبذول ہو تو علم و عمل کا ایک دریا پھوٹ پڑے گا۔ کاش کہ کم از کم ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اس قسم کی سوچ کا عادی بن جائے۔

خدا بینی کے بعد خود بینی ہے۔ اپنی خود کی پہچان ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ ہر انسان میں قدرت کی طرف سے کچھ نہ کچھ خصوصیت یا صلاحیت موجود ہے۔ ایمرسن کا کہنا ہے کہ میں جس شخص کو بھی دیکھتا ہوں وہ مجھ سے کسی نہ کسی طرح بہتر ہے۔

(EVERY MAN, I MET IS MY SUPERIOR
IN SOME WAY OR OTHER)

جب یہ خوبی دوسروں کو نظر آئے اور ہمیں خود اس کا پتہ نہ ہو تو افسوس کی بات ہے۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمال موجود ہے جس کے بغیر انسان آج نہ چاند پر قدم رکھ سکتا تھا نہ کسی کو آزادی کی قوت پیدا کر سکتا تھا۔ فلسفی، ادیب، حکیم، مدبر، مفکر، سائنسداں، عالم، فاضل، انبیاء، اولیاء کو چھوڑیئے۔ معمولی انسانوں میں بھی ایسی قوت و صلاحیت موجود ہے جس کے بغیر اعلیٰ دماغ کچھ نہ کر پا سکتے تھے۔ نپولین کی فتوحات اس کے سپاہیوں کی ہمت و بہادری کا عطیہ ہے۔ لہلہاتے کھیت کاشتکار کی محنت کا ثمرہ ہے۔ دنیا سے سوا مزدوروں کے پسینہ سے فراہم ہوتا ہے۔ ہماری خوراک، پوشاک، مکان، دھن دولت، رہن سہن، عزت و عظمت سب کچھ غریبوں کے خون کا مرہونِ منت ہے اور یہ غریب یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کس قدر غافل ہیں کہ خود کو ساہوکاروں کی عیش و عشرت کا سامان تیار کرتے ہیں۔ یہ اپنی صلاحیتیں جان جائیں تو سرمایہ داروں میں تہلکہ مچ جائے گا کچھ تو شعور عوام میں آج کل آ رہا ہے۔ ہمارے ہی دیش کے چناؤ کو لیجیے۔ کیسے عوام کے پیچھے لیڈر دوڑتے ہیں۔ اگر زندگی کے ہر شعبہ پر عوام میں اتنا جذبہ آ جاتا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو صرف موزوں قدر و قیمت پر ہی فروخت کر سکیں تو ہماری غریبی، تنگدستی، جہالت سب کچھ دور ہو سکتی ہے۔ ہماری مصیبتوں کا علاج دوسرے کر نہیں پاتے ہم کو خود اپنا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس کے لیے چند چیزیں درکار ہیں۔

پہلے اپنی قابلیتوں کا احساس۔ قدرت سے ہمیں بہت کچھ ملا ہے۔ زمین سے

ذہین اور معمولی آدمی کے درمیان وسیع خلیج حائل نہیں۔ بلکہ فرق صرف انیس بیس کا ہے۔ ایک شخص اپنی کوشش و محنت و استقلال سے بامِ عروج پر پہنچ جاتا ہے، اور دوسرا اپنی سستی و مستی کی وجہ سے مصیبت میں گھر پڑتا ہے۔ قدرت نے ہر انسان کو ویسی ہی قوت دی تھی۔ ایک نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دوسرے نے اس کو ضائع کیا۔ رومی کا کہنا ہے ؎

ہر دو گون آہو گیا خوردند و آب — زیں یکے سرگیں شد و زاں مشکِ ناب

جنگل میں دونوں ہرن ایک ہی گھاس چرتے اور پانی پیتے ہیں لیکن ایک کے پیٹ سے گوبر نکلتا ہے اور دوسرے سے مشک۔ اسی طرح انسانوں میں کسی ایک کی ذات سے بخل و حسد نکلتا ہے اور دوسرے کی ذات سے نورِ احد گو کہ دونوں کی خوراک ایک ہی ہے ؎

ایں خورد زاید ہمہ بخل و حسد — آں خورد زاید ہمہ نورِ احد

اس لیے سب سے پہلے انسان کی نیت، ارادہ اور خیالات نیک ہونے چاہئیں۔ احساس و نیت کے بعد عمل کا مقام آتا ہے۔ قابلیت موجود رہنا اور اس کا علم و احساس بھی ہو لیکن استعمال طریقہ معلوم نہ ہو۔ پاس خزانہ موجود ہے۔ اور ہم اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے۔ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ ہمارے جوہر کمال، ہنر، علم، حکمت، قابلیت صرف اس وقت سود مند ہوں گی جبکہ ہم محنت و مشقت کے عادی بن جاتے ہیں۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی — کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی
چھپا دستِ ہمت میں زورِ قضا ہے — مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

اس لیے ضرورت اس بات کے سوچنے کی ہے کہ کسی کام کو بھی اگر ہم پہلے سے پورا کرنے کا پکا ارادہ کر لیں اور عمل میں لگ جائیں تو ہم کٹھن سے کٹھن مرحلے بھی طے کر سکتے ہیں۔

اس کے لیے وقت کی اہمیت پہچاننا ضروری ہے۔ آپس کے تفرقے مٹانا ضروری ہے۔ اتفاق و اتحاد سے سرگرم رہنا ضروری ہے۔ غالب نے کس کمال سادگی سے ہمیں سوچنے کا انداز بتایا ہے ؎

نہ کہو گر برا کرے کوئی ــــ نہ سنو گر برا کہے کوئی
تھام لو گر غلط چلے کوئی ــــ بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہمارے شاعر، ادیب، مفکر، صوفی اور سارے مدبر یہی تعلیمات دیتے ہیں کہ ہمارے سوچنے کا طریقہ ٹھیک ہو۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ـــ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

"حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام ـــ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام"

علامہ اقبال نے تو ہمارے لیے ایک دفتر ہی کھول رکھا ہے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم ـــ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

انہوں نے سوال اٹھایا ؎

سنا یا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے ـــ وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

انہوں نے ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ؎

"تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی ـ کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارہ"

ہماری پستی سے اُبھارنے کے لیے انہوں نے للکارا ؎

"سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا ـ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا"

خلوصِ دل سے انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگی ؎

"بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو ـــ سینوں کو اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے"

اگر ہمارے سوچنے کا انداز بھی اس قسم کا ہو تو تعجب نہیں کہ ہماری کایا پلٹ جائے۔

خدا بینی اور خود بینی کے بعد جہاں بینی کا سوال آتا ہے۔ اس کی اہمیت بھی علامہ اقبال کے ہاں بہت ملتی ہے۔

"جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی ـــ جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا"

یہ تینوں امر، خدا بینی، خود بینی اور جہاں بینی ایک لحاظ سے الگ الگ نہیں لیا۔ ایک ہی مالا کے تین موتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ بھی ہے۔ جہاں بینی کا مسئلہ کائنات سے تعلق رکھتا ہے۔ خالق، فرد اور کائنات سب کچھ آئینۂ حق ہے۔ بوعلی سینا کا فلسفہ ہے کہ حسن آئینۂ حق ہے اور دل آئینۂ حسن ہے چونکہ ذاتِ الٰہی جمیل کا تقاضا

میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور اس کائنات میں فرد بھی ہے اور ساری خلقت بھی۔ تو ان سب
کی حقیقت ذاتِ الٰہی سے منسلک ہے۔ اس کائنات کو سمجھنے کے لیے ہمیں حسین خواب
دیکھنا ہوگا۔ ہمیں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے مادہ کو اتنا بلند کرنا ہوگا کہ بقول اقبال

"خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

یہ بلندی معمولی آدمیوں سے ممکن نہیں۔ یہ صرف ان خاص بندوں کے لیے مخصوص ہے
جو انسان کامل کہلاتے ہیں لیکن ہمارے لیے اتنی سمجھ بوجھ چاہیے کہ ہماری زندگی بلند ہو کر
نیچے کے زینے سے اوپر کے زینے تک پہنچ سکے۔

ہمارے بزرگوں نے کہا ہے کہ اس ترقی کے تین اہم زینے ہیں۔ نفس امارہ، نفس لوامہ
اور نفس مطمئنہ۔ نفس امارہ سب سے نیچے کا زینہ ہے۔ جب تک اس زینے کو جو کہ نفس پرستی
خود پسندی، خود غرضی اور شیطانی سب قوتوں کا سرچشمہ ہے دبایا نہیں جاتا، ہم اوپر کے
زینے تک نہیں پہنچ سکتے۔ جس قدر ہم زمین پر نیچے گرتے جائیں گے ہوا کا دباؤ زیادہ
ہوتا جائے گا۔ اور جس قدر ہم عالم بالا پر پہنچیں گے ہوا کا دباؤ ہلکا ہوتا جائے گا یہ قدرت
کا قانون ہے۔ اس لیے نفس امارہ پر ہماری نگاہ رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کی
خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"

نفس امارہ ہر جاندار میں موجود ہے کھانا، پینا، سونا، چلنا پھرنا، جنگل کے وحشی
بھی کرتے ہیں۔ اور کسی غیر انسانی مخلوق میں نفس امارہ سے بڑھ کر نفس لوامہ کی خصوصیتیں
بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے کتے کی وفاداری، چیونٹی میں مشقت کی عادت، شہد کی مکھیوں
کا ملاپ، اونٹ کا استقلال، گھوڑے کی تیزی، گدھے کی بردباری وغیرہ وغیرہ لیکن کسی
انسانوں میں اس قسم کی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی۔

[ENLIGHTENED

نفس امارہ کو پیچھے ڈال کر نفس لوامہ
کو آگے لائیں تو جہاں نیکی کے کئی خوشنما منظر ہمارے سامنے پیش ہوں گے گویا ہمارا نفس
ایک کنکر ہے جس کو اگر دریا میں پھینکا جاتے تو وہ پہلے ایک دائرہ بنائے گا اور وہ دائرہ
وسیع ہوتے ہوتے ساحل تک موج کی صورت میں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح ہر انسان بھی
اپنی نفس پرستی کو چھوڑ کر خاندان پرستی، کنبہ پرستی، وطن پرستی، ملک پرستی، قوم پرستی کے منازل

نہ کہو گر برا کرے کوئی — نہ سنو گر برا کہے کوئی
تھام لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

ہمارے شاعر، ادیب، مفکر، صوفی اور سارے مذہب یہی صلاح دیتے ہیں کہ ہمارے سوچنے کا طریقہ ٹھیک ہو۔

"آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است — با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا"

حافظ شیرازی کہتے ہیں ؎

"حافظ گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام — با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام"

علامہ اقبال نے تو ہمارے لیے ایک دفتر ہی کھول رکھا ہے ؎

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

انہوں نے سوال اٹھایا ؎

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا؟ زور حیدر، فقر بوذر، صدق سلمانی

انہوں نے ہماری دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا ہے ؎

"تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی — کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارہ"

ہماری پستی سے ابھارنے کے لیے انہوں نے للکارا ؎

"سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا"

خلوص دل سے انہوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا مانگی ؎

"بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو — سینوں کو اجالا کر دل صورت مینا دے"

اگر ہمارے سوچنے کا انداز بھی اس قسم کا ہو تو تعجب نہیں کہ ہماری کایا پلٹ جائے۔

خدا بینی اور خود بینی کے بعد جہاں بینی کا سوال آتا ہے۔ اس کی اہمیت بھی علامہ اقبال کے ہاں ملتی ہے۔

"جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا"

یہ تینوں مرکز خدا بینی، خود بینی اور جہاں بینی ایک لحاظ سے الگ الگ نہیں ہیں۔ ایک ہی مالا کے تین موتی ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ بھی ہے۔ جہاں بینی کا مسئلہ کائنات سے تعلق رکھتا ہے۔ خالق، فرد اور کائنات سب کچھ آئینہ حق ہے۔ بوعلی سینا کا فلسفہ ہے کہ حسن آئینہ حق ہے اور دل آئینہ حسن ہے۔ چونکہ ذات الٰہی تجلی کائنات

میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور اس کائنات میں فرد بھی ہے اور ساری خلقت بھی۔ تو ان سب
کی حقیقت ذات الٰہی سے منسلک ہے۔ اس کائنات کو سمجھنے کے لیے ہمیں خیال تو سب
دیکھنا ہوگا۔ ہمیں سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے مادہ کو اتنا بلند کرنا ہوگا کہ بقول اقبال

" خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے "

یہ بلندی معمولی آدمیوں سے ممکن نہیں۔ یہ صرف ان خاص بندوں کے لیے مخصوص ہے
جو انسان کامل کہلاتے ہیں لیکن عوام کے لیے اتنی سمجھ بوجھ چاہیے کہ ہماری زندگی بتدریج
نیچے کے زینے سے اوپر کے زینے تک پہنچ سکے۔

ہمارے بزرگوں نے کہا ہے کہ اس ترقی کے تین اہم زینے ہیں۔ نفس امارہ، نفس لوامہ
اور نفس مطمئنہ۔ نفس امارہ سب سے نیچے کا زینہ ہے۔ جب تک اس زینے کو جو نفس پرستی
خود پسندی، خود غرضی اور شیطانی سب قوتوں کا سرچشمہ ہے دبایا نہیں جاتا ہم اوپر کے
زینے تک نہیں پہنچ سکتے۔ جس قدر ہم زمین سے نیچے گرتے جائیں گے ہوا کا دباؤ زیادہ
ہوتا جائے گا۔ اور جس قدر ہم عالم بالا پر پہنچیں گے ہوا کا دباؤ ہلکا ہوتا جائے گا یہ قدرت
کا قانون ہے۔ اسی لیے نفس امارہ پر ہماری نگاہ نہ رکنی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کی
خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے۔

" ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔ بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے "

نفس امارہ ہر جاندار میں موجود ہے۔ کھانا، پینا، سونا، چلنا پھرنا جنگل کے وحشی
بھی کرتے ہیں۔ اور کسی غیر انسانی مخلوق میں نفس امارہ سے بڑھ کر نفس لوامہ کی خصوصیتیں
بھی پائی جاتی ہیں۔ جیسے کتے کی وفاداری، چیونٹی میں مشقت کی عادت، شہد کی مکھیوں
کا سلیقہ، اونٹ کا استقلال، گھوڑے کی تیزی، گدھے کی بردباری وغیرہ وغیرہ لیکن کئی
انسانوں میں اس قسم کی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی۔

نفس امارہ کو پیچھے ڈال کر نفس لوامہ (ENLIGHTENED)
کو آگے لائیں تو جہاں نیکی کے کئی خوشنما منظر ہمارے سامنے پیش ہوں گے گویا ہمارا نفس
ایک کنکر ہے جس کو اگر دریا میں پھینکا جائے تو وہ پہلے ایک دائرہ بنائے گا اور وہ دائرہ
وسیع ہوتے ہوتے ساحل تک موج کی صورت میں پہنچ جائے گا۔ اسی طرح ہر انسان بھی
اپنی نفس پرستی کو چھوڑ کر خاندان پرستی، قبیلہ پرستی، وطن پرستی، ملک پرستی، قوم پرستی کے قائل

سے گزرتے گزرتے انسان یہاں تک پہنچ جائے گا، جہاں نفسِ لوامہ اس کا استقبال کرے گا۔ حالی نے کہا ہے ؎

"یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں ــــ کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں"

جب ہمارا نفسِ لوامہ مضبوط ہو جاتا ہے تو ہمیں یوں معلوم ہوگا ؎

"تکمیلِ بشر نہیں ہے سلطاں ہونا ــــ یا صف میں فرشتوں کی نمایاں ہونا"

"تکمیلِ بشر ہے بندگی کا احساس ــــ انسان کی معراج ہے انساں ہونا"

نفسِ لوامہ سے اونچا مقام نفسِ مطمئنہ ہے (SPRITURI SELF) یہاں اولیاء، انبیاء، صوفی اور خدا کے برگزیدہ بندے خالق کی خاص رحمت کے حقدار بنتے ہیں۔ اس مقام کا ذکر شاید یہاں ضروری نہیں۔ اتنا جاننا کافی ہوگا کہ نفس کی منزلوں سے اگر انسان گزرے تو اس کے تجربوں میں تین قسم کے یقین کا پہلو پیدا ہو جاتے گا۔ وہ ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ یہ تینوں علم کے درجے جہاں جینے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی قسم کے علم سے احتسابِ کائنات کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب احتسابِ کائنات کا شعور آجائے تو ہماری نظر وہاں جا کر رُکے گی جہاں ؎

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

کہا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کو عزت سے جینے کی ہوس ہو تو کائنات کا جائزہ لینا ضروری بن جاتا ہے۔ یہ آسان کام نہیں، لیکن اشرف المخلوقات کے ناطے جو بھی صلاحیتیں ہمیں ملی ہیں ان کا پورا استعمال کرنا از بس ضروری ہوگا۔ دنیا میں آج کئی قومیں اس راہ پہ گامزن ہیں۔ صرف عالمِ اسلام اپنے تفرقوں میں بٹا ہے۔ صحت کے اصول پر جب تک نگاہ نہ ہو، بیماری دور نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہمیں اپنے سوچنے کا انداز بدلنا ہوگا۔

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا حصّہ

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمان پیش پیش نہیں رہے۔ انہوں نے شروع ہی سے ایسے اختلافی جھگڑوں کی بنا ڈال کر جن سے کئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ حصولِ آزادی میں کافی دیر لگی۔ مادرِ وطن کی وحدت کو دھکا لگا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور عوام کو ایسی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے ملک میں ہمارا سماجی، سیاسی، اقتصادی و ثقافتی نظام درہم برہم ہو گیا۔ لوگ بٹ گئے۔ کٹ گئے۔ ہزاروں کی جانیں لاکھوں کی تعداد میں آبادی کو لٹ لٹا کر مصیبتوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہونا پڑا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلم قیادت اپنی علیحدہ قومیت پر مصر رہی۔ ملک کی دوسری جماعتوں سے تعاون نہیں کیا۔ اپنے مفاد کے لیے شرائط ہمیشہ پیش کرتی رہی جو اکثریت کو ناقابلِ قبول تھیں۔ ملک کی تقسیم کے علاوہ کوئی اور علاج نہیں رہا۔ ضروری ہوا جس کا خوف تھا کہ بھائی بھائی سے بچھڑ گیا۔ گھر بار، خاندان، رشتہ، کنبہ، عزت، دولت، جان، مال سبھی خسارے میں پڑ گئے۔ سب سے بڑھ کر نفرت کا وہ بیج بویا گیا جس کا زہریلا پن آج بھی قومی فضا کو مکدر کر رہا ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک لمبی چوڑی کہانی ہے۔ اس کا سارا مصالحہ ایک دن میں تیار نہیں ہوا۔ پورے ۱۹۰ سال میں بنا۔ اس کی ابتدا ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست سے شروع ہوئی اور ۱۹۴۷ء میں محمد علی جناح کی قیادت میں انتہا کو پہنچی۔ سب سے پہلے ایک بات ذہن میں ضرور رکھنا ہے۔ وہ یہ کہ ایسا خیال کہ مسلمان جنگ آزادی میں شریک نہیں رہے سراسر غلط ہے۔ اگر جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے

کوئی جاننا چاہے تو بنگال کے سراج الدولہ یا میر قاسم سے پوچھے یا لکھنؤ کے آصف الدولہ سے دریافت کرے یا میسور کے حیدر علی خاں کے اُن دندان شکن حملوں سے اندازہ کرے جو انہوں نے انگریزوں پر مسلسل جاری رکھے تھے۔ یا ٹیپو سلطان شہید کی خونِ جاناں کا سے جا پہنچے یا اُن کی اس للکار کی یاد تازہ کرے کہ؎

"شیر کا جینا ہے جسے مہلت ایک روز ملی ۔۔۔ یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ طلوع"

یا اُن کے ان خوابوں کو پڑھے جو وہ ہر صبح لکھ دیا کرتے تھے جن میں ان کی نیند کا ہر لمحہ انگریزوں کے خلاف رزم آرائی میں لپٹا ہوا ہوتا تھا یا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے رول پر غائرانہ نظر ڈالے یا بہادر شاہ ظفر کے ان احساسات کو ذہن میں رکھے جو اس جنگ آزادی میں پسپا ہو کر بحیثیت قیدی رنگون کی جیل میں شاعرانہ جذبات سے مضطرب ہو کر شاید گنگناتا ہو؎

"عندلیبا ہم نے خود قفس کے شوق میں ۔۔۔ نکلا چند تیلیوں کے لیے ہم راہ میں"

یا البلاغ اور الہلال یا کامریڈ اور زمیندار کے صفحے چاٹ ڈالے یا مولانا محمد علی جوہر کی تقاریر سے حریت کا مفہوم سمجھے یا مولانا حسرت موہانی یا مولانا محمود الحسن یا مولانا حسین احمد مدنی یا مولانا عبدالباری یا مولانا ابوالکلام آزاد کی اُن مجاہدانہ کوششوں پر نظر ڈالے جو انصاف کی تاریخ میں محفوظ ہیں یا ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ والے کانگریس و لیگ کے اس معاہدہ پر غور کرے جس سے ہندوؤں و مسلمانوں کے ملاپ کی خوشبو چھلکتی ہے یا ۱۹۲۰ء کی اس تحریک خلافت کو ذہن میں رکھے جس سے مہاتما اور مولانا کی تفریق مٹ گئی تھی اور ہندو مسلمان انسانیت کے ناتے میں جڑ گئے تھے کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم علامہ اقبال کے اس شعر کی داد دے؎

"پتھر کی مورتی کو سمجھا ہے تو خدا ہے ۔۔۔ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"

پلاسی کی جنگ سے لے کر مولانا آزاد کی کانگریس صدارت تک مسلمان انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ مگر مقابلہ ایک طرف دلِ ناتواں کا اور دوسری طرف ایسے ساحرانِ مغرب کا جن کے سیاسی چال و اور بیارانہ تلوار و توپ کا بدترین استعمال مسلمانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے کوتاہی کی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ

"گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑی —— سب سے پہلے ہماری ہی گردن کٹی"
"پھر بھی کہتے ہیں یہ اہلِ وطن —— یہ وطن ہمارا ہے تمہارا نہیں"

آخر یہ بات ہے تو مسلمانوں پر الزام کیوں؟ اس لیے کہ یہ حقیقت کھلی ہے کہ جنگ آزادی کے ۱۹۰ سال میں صرف سات سال (۴۷-۱۹۴۰ء) ایسے بھی گزرے ہیں جن میں پچھلے ۱۸۳ سال تک جو ناانصافیاں ہوئی تھیں اس کا ردعمل لاوے کی صورت میں پھوٹ پڑا۔ یہ طوفان ایسی شدومد سے اٹھا کہ مفاہمت کی ساری تدبیروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ باہمی تنازعات کا مرض ایسا ناسور بن گیا جس کا صرف نوک نشتر کے علاوہ کوئی اور علاج نہ رہا۔ غیر ملکی عیاری اور ایسا جال بچھایا کہ ساری خلقت اس کے دام فریب میں آگئی۔ حکومت و ثروت کی آس ایسے کھیل کھیل کر ترتیب کے پیمانے جوش میں ہوش بھول گئے۔ آزادی و خود مختاری، جاہ و جلال اور تخت و تاج کا تصور دل و دماغ پر ایسا چھایا کہ ملک کی وحدت کا خیال حقیر سمجھا گیا۔ حقیقت کے میزان میں ذاتی مفاد کا پلہ ملکی و سماجی مفاد کے پلے سے بھی زیادہ وزنی نظر آنے لگا۔ وہ قائد کے رہنما جو ملک کی سالمیت و عظمت و حریت کا پرچم برسوں اپنے ہاتھوں میں تھامے رہے اور کسی صورت بھی پر آنچ نہ آنے کا عزم دار رہ۔ کہتے تھے وہ تاج واحد میں ایسا پاسے کہ گھر وہ پرچم دو ٹکڑے کپڑا تھا چاہے چیڑ پھاڑ دو چاہے گرد و دریدہ سر جب بڑھا تو سر کے قلم کرنے کی ہی سوجھی نہ کہ تھوڑی سی برداشت کی تاکہ جسم کو قدرت سے ودیعت کی گئی طاقت کو مدافعت کا موقع ملے۔ علاج مرض سے کہیں زیادہ موذی ثابت ہوا اور آج بھی اس علاج کے تاثرات سارے برصغیر ہندوستان پر سانپ اور اژدہے کے زہر سے بھی زیادہ مضر و خطرناک نظر آرہے ہیں۔

اس کا ذہنی پس منظر جانچ لیں تو ان حالات کے اسباب عیاں ہو جائیں گے۔

مسلمانوں نے چند جائز حقوق مانگے تھے۔ یہ آپس میں بھائی بھائی کا معاملہ تھا۔ تکرار و اصرار بھی آپسی تعلقات کا ایک یقینی جز ہے۔ جائداد، سرمایہ، زر، زیور، زمین کے لیے بھائی بھائی آپس میں لڑتے ہیں، لیکن جہاں دل صاف ہوا اور انصاف ہو تو مسئلات کا حل بھی تلاش کر لیتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا نہیں ہوا۔ آزادی سے کچھ سال پہلے جب قومیت (نیشنلزم) کی تحریک تھی تو مسلمان گھبرا اٹھے کہ اس تحریک کا مقصد

جمہوری نظام ہے اور جمہوری نظام میں لوگوں کے سر گنے جاتے ہیں تولے نہیں جاتے۔
چونکہ مسلمان اقلیت میں تھے انہیں خیال آیا کہ اس نظام میں ان کے مفاد کو دھکا لگے
گا۔ اس لیے ان کے تحفظ کے لیے انہوں نے اپنے حقوق کی گارنٹی مانگی۔ اگر ان کے حقوق
کو مان لیا جاتا تو ہندوستان کبھی نہ کٹتا۔ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ والے سمجھوتہ پر اگر ٹھیک
عمل پیرا ہوجاتا تو سارا قضیہ رفع دفع ہوجاتا۔ مسلمانوں نے اس معاہدے کے تحت
اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ وہ بنگال اور پنجاب میں خود اکثریت میں رہتے
کے باوجود اپنی جائز نشستوں سے بھی کم نشستیں لیں گے۔ بنگال میں جہاں وہ آبادی
کے لحاظ سے ۵۴ فیصد تھے صرف ۴۰ فیصد نشستیں اور پنجاب میں بھی اپنی آبادی سے
کم فیصد نشستیں لینے پر راضی ہوگئے۔ تاکہ ملک کے دوسرے صوبوں میں
مسلمانوں کو ان کی آبادی سے کچھ زیادہ مراعات دی جائیں اور مرکزی ایوان میں ایک تہائی
فی صد نشستیں مل سکیں۔ اس سمجھوتہ پر کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ بارہ برس گزر گئے اور ۱۹۲۸ء
میں موتی لعل نہرو رپورٹ تیار ہوئی۔ اس کے تحت ۱۹۰۹ء سے چلے آتے جداگانہ انتخاب
کا حق بھی چھین لیا گیا۔ مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ محمد علی جناح نے اپنا چودہ
نکاتی مطالبہ پیش کر دیا جس میں سیاسی افراتفری نہیں تھی۔ سندھ کو بمبئی صوبے
سے الگ کرنے کا مطالبہ تھا اور بقیہ نکات لکھنؤ والے سمجھوتے سے متعلق چند
ترمیمیں تھیں ان کو بھی رد کر دیا گیا۔ سب سے زیادہ نازک وقت وہ آیا جبکہ
۱۹۳۵ء کی اصلاحات پر عمل پیرائی شروع ہوئی کانگریس نے سات صوبوں میں
اپنی حکومت قائم کی اور لیگ نے کہیں نہیں۔ یہ کانگریسی حکومتیں صرف دو سال
رہیں اور دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے فوراً بعد ختم ہوگئیں۔ لیکن اس دوران
خاص کر یوپی میں کانگریس کا رویہ جس قسم کا رہا اس سے مسلمانوں کو یہ خوف پیدا
ہوگیا کہ ہندوستان میں ان کا مستقبل تاریک ہے۔ انہوں نے نعرہ بلند کیا "اسلام
خطرہ" میں ہے۔ ان چند مہینوں کی کانگریسی حکومت کا ردعمل یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۴۰ء
میں لاہور والی سیشن میں پاکستان کی تجویز منظور ہوگئی۔

یہ تجویز بہت تعجب خیز تھی۔ سات صدی سے بھی زیادہ ہندوستان میں مسلمان
رہ بس گئے تھے کبھی انہوں نے اپنے کو ملک کے دیگر لوگوں سے الگ نہیں سمجھا تھا

بلکہ ان سے ایسے مل گئے تھے کہ جب بابر بادشاہ ہندوستان آیا اور یہاں کی ملی جلی تہذیب کو دیکھا تو اس کو تعجب ہوا کہ وہ دیگر اسلامی ممالک کی تہذیب سے بالکل مختلف تھی۔ اور اسی لیے اس نے اس کو "ہندو تہذیب" یا "اسلامی تہذیب" نہیں کہا بلکہ "ہندوستانی تہذیب" کہا۔ مغلوں نے ترکوں اور پٹھانوں سے کہیں زیادہ اس ملک کی تہذیب کو کسی ایک فرقہ یا جماعت کی تہذیب نہ سمجھا اس کی ترتیب میں حصہ لیا کہ اکبر کے زمانے میں ہندوستان یورپ کے ممالک کی طرح ایک نیشنل اسٹیٹ (قومی ریاست) بن گیا۔ ذات پات، مذہب، فرقہ وغیرہ کے اختلافات سب ختم کر دیے گئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی و تمدن کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا اور مسلمانوں نے ہندوؤں سے۔ اس زمانے کی "بھگتی تحریک" اور صوفیائے کرام کی کاوشیں ہماری تاریخ کے سنہری اوراق ہیں۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں نظامِ سلطنت کے ایسے اصول تراشے جن کو بعد میں انگریزوں نے سراہا اور اپنایا۔ ملک کی وحدت کو برقرار رکھنے، حکومت میں حق واقف نہ رہے، مذہبی تعصبات کو مٹانے، آپسی ملاپ کو بڑھانے، ملک کی زراعتی، صنعتی، تجارتی اور فوجی طاقت کو مضبوط کرنے، تہذیب و تمدن اور فلاح و بہبودی کو عام کرنے میں مغلوں نے ایسے نمایاں قدم اٹھائے کہ ہندوستان کی تاریخ میں آج بھی ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ کوئی آگرہ کا قلعہ یا تاج محل جا کے دیکھے، یا دہلی کا قلعہ یا جامع مسجد یا موتی مسجد، دیوانِ عام یا دیوانِ خاص یا فتح پور سیکری کا بلند دروازہ یا ہمایوں کے مقبرے کی سیر کرے، بابر کی تزکِ بابری یا ہمایوں نامہ یا تزکِ جہانگیری یا فتاویٰ عالمگیری پر نظر ڈالے یا دنیا کی کسی بھی نمائش گاہ میں مغلوں کے نادر مصوری کے نمونے دیکھے یا اس زمانے میں ملک کی خوشحالی و ترقی کا ذکر تاریخ کے اوراق میں تلاش کرے یا یوروپی سیاحوں کے روزنامچے دیکھے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس ملک کی فلاح و بہبودی، ترقی و کامیابی، تہذیب و تمدن کے فروغ میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے سات سو سال میں جو کچھ بھی کیا اس کو سات سال (۱۹۴۰ - ۱۹۴۷ء) کے حالات سے ناپا یا تولا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ صدام حسین کی طرح مسلمانوں نے ان سات سال میں کئی غلطیاں بھی کیں۔

تاریخ کے ان واقعات کو دہرانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ دو قومی نظریہ کا پس منظر اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ صرف جنگ ہی میں نہیں سیاست میں بھی کامیابی کے لیے بعض شخصیتیں ہر قسم کا حربہ استعمال کرتی ہیں۔ سیاسی مقصد کے حصول کے لیے ہر حربہ حتیٰ کہ مذہبی حربہ بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ چھوٹی سی بات کو آسمان تک اچھالا جاتا ہے یہی حال ہندوستان کے اس فیصلہ کن سات سال میں ہوا۔ گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا، ہندی اردو کا جھگڑا، اسمبلی کی نشستوں کے لیے تکرار، ملازمتوں میں عہدوں کے لیے اصرار کا نتیجہ منافرت کے لیے فتنہ یہاں تک کہ آپس میں تہوار خُرم ہو یا ہولی، بقرعید ہو یا دیوالی، سبھی سیاسی شکاریوں کے لیے تیر بہدف نسخہ کا کام دینے لگیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ دو قومی نظریہ کب اٹھا، کیوں اٹھا اور اس کی ذمہ داری کس کے سر ہے۔ ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے ایک دو غلط فہمی کو دور کر دینا بہت ضروری ہے۔ عام طور پر یہ ساری ذمہ داری سرسید کے سر تھوپ دی جاتی ہے۔ یہ سراسر غلط بات ہے۔ سرسید نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست ہونی چاہیے۔ وہ ہمیشہ ایک متحدہ ہندوستان کے حق میں تھے۔ انہوں نے کبھی یہ بات زبان پر نہ لائی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ ہمیشہ ملک کی وحدت کی ہی بات کرتے رہے۔ انہوں نے "قوم" کے لفظ کو قوم (NATION) کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا، بلکہ جماعت کے معنی میں۔ انہوں نے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سبھوں کو ہندوستان کی الگ الگ قوم اس معنی میں سمجھا کہ ہر گروہ اپنی اپنی تہذیبی امتیاز کی وجہ قابل تحسین ہے اس معنی میں نہیں کہ انہیں ہندوستان کا ایک ایک الگ ٹکڑا کاٹ کر دے دیا جائے۔ اگر ہم سرسید کی تحریروں اور تقریروں کا غور سے مطالعہ کریں تو سارے شکوک کہ وہ دو قومی نظریہ کے حامی تھے، دور ہو جائیں گے۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں نے کہا تھا "ہم دونوں (ہندو اور مسلمان) ہندوستان کی ہوا سے زندہ ہیں، یہاں کی مقدس گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں۔ ہم دونوں یہاں کی زمین سے اُگے اناج کھاتے ہیں، ہم دونوں موت و حیات میں ساتھ ساتھ ہیں۔ ہندوستان میں بستے بستے کچھ بدل گئے ہیں..... بدقسمتی انہیں ضرور تباہ کر دے گی" پنجاب کے ہندوؤں کو انہوں نے مخاطب کر کے کہا تھا "آپ نے اپنے

لیے ہندو کا لفظ استعمال کر لیا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال سے لفظ ہندو کسی خاص مذہب کا اشارہ نہیں دیتا اس کے برعکس ہندوستان کے ہر باشی کا حق ہے کہ وہ اپنے کو ہندو سمجھے۔ اس لیے مجھے افسوس ہے کہ حالانکہ میں ہندوستان میں بستا ہوں، پھر بھی آپ مجھے ہندو تصور نہیں کرتے۔" سرسید نے اپنے ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء کی پٹنہ والی تقریر میں کہا تھا "براہ کرم حضرات یاد رکھیے کہ ہندو و مسلم یا عیسائی اس ملک کے باشی ہونے کے ناتے ایک قوم ہیں..... وہ وقت گزر گیا جبکہ صرف مذہب کی بنا پر ہمارے ملک کے باشندوں کو دو قوموں کے افراد قرار دیا جاتے۔" ٹھیک ایک سال بعد ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو گرداسپور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو دل و جان سے ایک بن جانے کی اور یکجہتی سے کام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ ایک دوسرے کی مخالفت دونوں کے لیے تباہ و تاراج کا باعث بنا جائے گی۔" سرسید نے ہندوؤں و مسلمانوں کو ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی تھی جس کا چہرہ کسی ایک آنکھ کے زخمی ہونے پر بھی مسخ ہو جائے گا۔"

لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ سرسید کا سیاسی نظریہ کانگریسی مطمح نظر سے کچھ علیحدہ تھا۔ سیاسی اختلافات کے یہ معنی نہیں کہ وہ ملک کا بٹوارہ چاہتے تھے۔ ہم خیال نہ ہونا مخالفت کے مترادف نہیں ہے۔ ایک ہی خاندان یا کنبہ کے مختلف افراد کی اپنی اپنی جداگانہ رائے رکھتے ہیں اور ترقی کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔ جس کمیٹی میں ہر مسئلے پر اتفاق رائے ہو اس کمیٹی کے ارکان میں سوچنے کا مادہ کچھ کم ہی ہوتا ہے یا تو وہ کسی کے دام فریب میں آگئے ہوں گے یا کسی کے رعب داب سے دب گئے ہوں گے یا ایسے ناقص ذہن رکھتے ہوں گے جو فیصلوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لیے سرسید کی مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ وہ چند سال سیاست میں نہ پھنس کر تعلیمی، تہذیبی، سماجی و اقتصادی حالت درست کر لیں، اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ یہ ہدایت دو قومی نظریہ کی اصل جڑ ہے۔ بچہ کو آگ کے پاس نہ جانے کی نصیحت اس بات کی دلیل نہیں کہ ناصح آگ کی افادیت سے واقف نہیں۔ سرسید کی صرف یہ خواہش تھی کہ مسلمان جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے سیاسی دوڑ میں داخل ہونے سے پہلے اوروں کے برابر صف اول میں آجائیں ورنہ مقابلہ ایسا کٹھن ہوگا کہ وہ کامیابی کے پرچم کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔

''مستیٔ ناز گستاخ مشکل تھی ـــ احتیاط گستاخ کیا کرتے؟''
والا معاملہ تھا۔ سرسید بھی چاہتے تھے کہ مسلمان اوجِ ثریا پر مقیم ہوں مگر اس کے لیے پہلے ''قلب سلیم'' پیدا کرنا پڑتا تھا۔ مسلمانوں کے پاس قلب سلیم تو کیا نان شبینہ سوکھی روٹی پیدا کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس صورت حال میں یہ عاشقی چہ سہی دارد؟

سرسید کی پالیسی کو سمجھنے کے لیے تاریخی پس منظر بھی درکار ہے۔ سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی پستی، مفلسی، بے چارگی، پشیمانی، زبوں حالی، مایوسی، جہالت اور غربت اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ ان کا دماغ مسلسل مجبوریوں، ناکامیوں، ناانصافیوں اور تلخ محرومیوں کی وجہ سے بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ مسلسل ایک سو سال تک غیر ملکی اقتدار کے خلاف لڑتے لڑتے وہ تھک گئے تھے۔ بار بار شکست سے ان کی قوت مدافعت جواب دے چکی تھی۔ انگریزوں کے غلبے سے اُن کی حکومت چھن گئی تھی۔ دیوانی اور عدالتی محکموں میں اُن کے لیے ملازمت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ لارڈ کارنوالس کی اصلاحات سے اُن کی زمینداری ختم ہو گئی تھی۔ میکالے کی وجہ سے فارسی کی جگہ انگریزی کا بول بالا تھا۔ دفتروں سے، درس گاہوں سے اردو فارسی ہٹائی جا رہی تھی۔ مسلمان اس صدمے سے بلبلا اٹھے۔ لیکن ان کی غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ اپنی آبائی و مادری زبان کو چھوڑ کر پرائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑیں۔ لیکن ملک کی دیگر اقوام نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ راجہ رام موہن رائے کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ زندگی کے ہر شعبے میں پیش پیش رہے۔ مغربی علوم نے اُن کی کایا پلٹ دی۔

ایسے نازک وقت پر مسلمانوں کو سرسید کی قیادت نصیب ہوئی۔ ان کا دور ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ انہوں نے چند ہزار مسلمانوں کو جو دہلی کی جامع مسجد میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے خطاب کیا۔ ان کی پالیسی کے دو جز تھے۔ ایک تو یہ کہ سماجی، اقتصادی، تہذیبی و تعلیمی امور میں انگریزوں سے تعاون کیا جائے۔ انگریزی پڑھنے لکھنے اور اس کے ذریعہ مغربی علوم حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کی جائے۔ روایتی طریقوں کو چھوڑ کر جدید طرز زندگی اختیار کیا جائے۔ زندگی کے تمام امور حتیٰ کہ مذہبی مسئلوں کو بھی جدید علوم کی روشنی میں پرکھا جائے۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم عام کی جائے۔ اس کے لیے مدارس قائم کیے جائیں۔ تعلیمی

کانفرنسوں کا انعقاد عمل میں لایا جاتے۔ عوام کی اخلاقی و سماجی اصلاح کے لیے ادارے قائم کیے جائیں جیسے سائنٹیفک سوسائٹی و راس کے پرچار کے لیے تہذیب الاخلاق وغیرہ۔ اُن کی پالیسی کا دوسرا اہم جزیہ تھا کہ سیاسی معاملوں میں مسلمان انگریزوں کے خلاف احتجاج نہ کریں۔ پچھلی ایک صدی سے جو مخالفت کی گئی تھی اس کا رویہ بدلیں۔ انگریز کو دشمن نہ سمجھیں۔ مصلحتاً یہ تسلیم کریں کہ سیاسی میدان میں مسلمان انگریز کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ جب حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اس وقت مقابلہ نہ ہو سکا تو اب تھکے ہارے کیا خاک مقابلہ ہو؟ اس لیے حکومتِ وقت سے مخالفت نہیں، وفاداری کا شعار اختیار ہو۔ باالفاظ دیگر سرسید کی پالیسی مثبت (POSITIVE) بھی تھی اور منفی (NEGATIVE) بھی۔ مثبت اس لحاظ سے کہ جدید علوم و طرزِ زندگی کو قبول کر لیا جائے اور منفی اس لحاظ سے کہ ملک کی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ آئینی اصلاحات کے لیے شور و غل نہ کریں۔ انگریزوں سے مسلط شدہ امن و آشتی کی قدر و منزلت کریں اور ان کی فراخدلی و منصفانہ مزاجی سے یہ امید رکھیں کہ جب مسلمانوں کی حالت سدھر جائے گی یا کم از کم تعلیمی میدان میں دیگر اقوام کی برابری کرنے لگے گی تو ملکی اصلاحات میں مسلمانوں کو بھی اُن کا جائز حق مل جائے گا۔ مگر جب تک ان کی تعلیمی، سماجی اور تہذیبی حالت نہیں سدھرتی سرسید کے خیال میں سیاست میں کودنا خودکشی کرنے کا مترادف ہوگا۔

سرسید کا یہ سوچنا تھا کہ تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ کر سیاست میں کود پڑنے سے مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہیں گے۔ تعلیم کا نہ ہونا جہالت ہے اور جہالت سیاست میں بھی کام نہ آئے گی۔ ہوگا یہ کہ وہ کسی اور کے غلام بن جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ انگریزوں کے خلاف احتجاجی سیاست سے حکومتِ وقت اور زیادہ ناراض ہوگی۔ پہلے سے ہی اُس کا رویہ ظالمانہ رہا ہے اور اب سونے پہ سہاگہ ہوگا۔ تعلیم کی طرف جو تھوڑا رجحان پیدا ہوا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ اپنے بل بوتے پر جدید علوم کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ اُن میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ ایسی درسگاہیں اور ادارے قائم کریں جن سے ان کے بچوں کو جدید مغربی تعلیم حاصل ہو سکے۔ انگریزوں سے اچھے تعلقات ہوں تو حکومتِ وقت مسلمانوں کی مدد

سکے گی اور ایسے ادارے قائم ہو سکیں گے۔ چونکہ وجہ یہ تھی کہ حکومت وقت سے ناچاقی مسلمانوں کے لیے اس لیے بھی مضر ہوگی کہ ان کے لیے ملازمت کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ جب تک حکومت اقلیتوں کو خاص مراعات نہ دے، مسلمان کھلے مقابلوں کے امتحانات میں کامیاب نہ ہوں گے اور جب تک مسلمان منصفی، کلکٹر، ڈپٹی کمشنر، تحصیلدار، تھانیدار، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر نہ بنیں گے ان کی زندگی کیڑے مکوڑوں جیسی رہے گی۔ ملازمتوں میں نشستیں مخصوص کرا لینا مقصود ہو تو انگریزوں سے دشمنی کرنا دودھ میں زہر ملانے کے برابر ہوگا۔ مگر حکومت وقت سے تعلقات خوشگوار ہوں تو سرکاری عہدوں میں تقرری کی آسانی ہوگی۔ اور مسلمان جلد ترقی کر سکیں گے۔ چنانچہ یہی سوچ کر سرسید نے علی گڑھ میں کالج قائم کیا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کئی قدم اٹھائے ان کی یہ پالیسی علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم ہوئی۔ سرسید ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ مسلمانوں نے سرسید کی پالیسی پر فوراً لبیک کہا۔ ان کی پالیسی کے خلاف ایک قیامت برپا ہوئی۔ یہاں تک کہ انہیں کفر کا فتویٰ بھی دیا گیا۔ جدید علوم کے خلاف علماء نے اپنا علیحدہ محاذ قائم کیا۔ ہر جگہ مدرسے و مکتب کھلے جو روایتی و تقلیدی قسم کے تھے۔ اس میں ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند بہت مشہور ہیں۔ ندوۃ العلماء شبلی نعمانی نے قائم کیا۔ وہ ایک جید عالم تھے، وہ علی گڑھ میں معلم بھی رہ چکے تھے۔ لیکن وہاں کے انتہائی مغربی رجحانات سے بیزار ہو کر مسلمانوں کی تربیت خالص اسلامی طریقے سے ہونا چاہیے سمجھ کر انہوں نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء دارالعلوم کی بنا ڈالی۔

اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت جو اس ادارے نے کی وہ ساری دنیائے اسلام کے لیے فخر و ناز کی بات ہے۔ خود شبلی نعمانی کی کئی تصانیف ایسی ہیں جو صرف اردو زبان کے جواہر پارے نہیں بلکہ تحقیق و تفتیش، علم و حکمت، تہذیب و تمدن، تاریخ و فلسفہ کے میدان میں ان کا مقابلہ دنیا کے کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ لٹریچر کے ساتھ کیا جا سکتا ہے ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے 'رحمۃ للعالمین' کی جلدوں کا افتتاح کیا جو بعد میں چل کر ان کے قابل جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کے قابل طریقے سے

اختتام کو پہنچایا۔ یہ مستند جلدیں ایسی ہیں کہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کے لیے باعث افتخار ثابت ہوں گی۔ مجھ ناچیز کا خیال ہے کہ دارالعلوم علی گڑھ بھی اس بلند پایہ کا کام انجام نہ دے پایا۔

ندوہ اور دیوبند صرف درس و تدریس تالیف و تصنیف ہی میں آگے نہیں رہے بلکہ سیاست پر بھی ان کا گہرا اثر پڑا۔ یہاں کے علماء نے وہ رویہ اختیار کیا جس کو اگر ملت کی اکثریت قبول کر لیتی تو ہندوستان کی تقسیم کبھی نہ ہوتی۔ یہاں جو ادارے تھے وہ سرکار کے رہین منت نہیں تھے۔ ان کا دارومدار ملت کی خودداری پر تھا۔ ان کا منشا ایسے نوجوان تیار کرنا تھا جو اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے راضی ہوں۔ اسلامی سانچہ مغربی سانچے سے بالکل الگ تھا۔ اس لیے ہوا یہ کہ علماء حکومت وقت کے پھر مخالف ہو گئے۔ ان کی یہ مخالفت انہیں کانگریس کے قریب کھینچ لائی۔ حتیٰ کہ یہ پکے نیشنلسٹ بن گئے۔ ان کے سب سے بڑا سرگروہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ انہیں کی ولولہ انگیز تحریریں جو الہلال و البلاغ میں چھپتی تھیں پڑھ پڑھ کر ندوہ و دیوبند کے علماء ملک کی آزادی اور یکتائی کے لیے بے انتہا قربانیوں کے لیے آمادہ ہو گئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کئی سال تک جلاوطنی کی مشقت برداشت کرتے رہے۔ انہیں کے ہاتھ سے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کی جامع مسجد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کی رسم عمل میں آئی۔ بعد میں چل کر ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں یہ ادارہ ملک کی مایہ ناز درسگاہ ثابت ہوا۔ آج اس کا مقام مرکزی یونیورسٹی کی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے اور علاوہ علی گڑھ کے یہ ملک کا واحد دوسرا ادارہ ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی کاوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے یہ ادارہ ایسے کارہائے نمایاں کر دکھایا ہے جن سے اخلاقی شخصیت کی روح بیدار ہوتی ہے۔ انسانیت کا چراغ روشن ہوتا ہے اور تہذیب کے موتی ڈھلتے ہیں۔ اس کے متعلق شاعر اسلام حفیظ جالندھری نے یہاں تک کہہ دیا ہے

"رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے۔ مدینے سے بھی وابستہ یہ طور لامرکزی ہے"

سیاسی قیادت کے لحاظ سے علی گڑھ اور جامعہ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ محمد علی جناح اور مولانا ابوالکلام آزاد میں تھا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ پاکستان کے حامی بنے

اور جامعہ ملیہ کے سبھی ارباب متحدہ ہندوستان کے حامی رہے۔ مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، عبدالمجید خواجہ اور دیگر کئی مشہور شخصیتیں جن کا جامعہ ملیہ سے تعلق تھا، ہندوستان کے نیشنلسٹ مسلم تھے۔ وہ ہندوستان کی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ پکے کانگریسی تھے۔ گاندھی جی کی قیادت کو مانتے تھے اور ان کے خیالات کو ہندوستان کے حق میں مفید جانتے تھے۔ تحریک خلافت کے اہم رکن تھے۔ اسلامی تہذیب سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ مغربی سیاست کے سخت مخالف تھے۔

مسلمانوں کی قیادت کا یہ عجیب کرشمہ تھا کہ جو لوگ علماء کہلاتے تھے، وضع قطع، لباس و طرز زندگی میں قرون وسطیٰ کی یادگار معلوم ہوتے تھے، وہ متحدہ ہندوستان کے پرستار تھے۔ جن لوگوں نے خود کو جدید مغربی علوم سے سنوارا وہ ہندوستان کی تقسیم پر مُصر رہے۔ پکے مذہبی اور اسلامی رنگ میں ڈھلے ہوئے مولوی نیشنلسٹ ثابت ہوئے اور بالکل ماڈرن مغربی علوم سے آراستہ اسلامی تہذیب سے محروم اسلامی سیاست کے طلب گار رہے۔ جو لوگ ظاہراً مذہبی نظر آتے تھے، وہ مذہب کے نام پر ملک کا بٹوارہ نہیں چاہتے تھے اور جو لوگ خود کو ترقی پسند کہتے تھے اور سیاست کو مذہب سے الگ رکھنا چاہتے تھے، وہ مذہبی فرقوں کے بل بوتے پر ملک کی تقسیم پر تلے ہوئے تھے۔ جدت تقسیم چاہتی تھی اور تقلید وحدت۔ مولانا نے ملاپ کا پیغام دیا۔ مغرب کی وکالت نشتر کے حق میں تھی۔ مولانا ہار گئے، نشتر والے جیت گئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد اول)

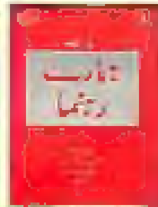


مترجم : اقبال مہدی زیدی

صفحات: 149

قیمت : -/35 روپے

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد دوم)

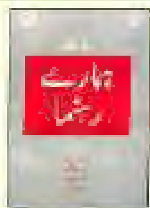


مترجم : سبط اصغر رضوی

صفحات: 172

قیمت : -/35 روپے

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد سوم)



مترجم : غلام حیدر

صفحات: 192

قیمت : -/35 روپے

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد چہارم)

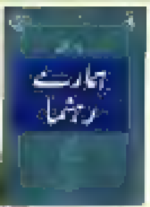


مترجم : غلام حیدر

صفحات: 108

قیمت : -/35 روپے

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد پنجم)



مترجم : رفیق محمد شاستری

صفحات: 107

قیمت : -/36 روپے

یاد کیجیے ہمارے رہنما (جلد ششم)

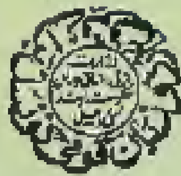


مترجم : محمد عمر برنی

صفحات: 128

قیمت : -/35 روپے


ISBN: 978-81-7587-344-5



क़ौमी कौन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025